ہندوستان کے

تعلیمی مسائل

از

مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ

حیدرآباد دکن

۱۸؍ دسمبر ۱۹۲۵ء

فہرست مضامین

صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبہ صدارت جلسۂ تعلیمی حیدرآباد دکن

منعقدہ ۱۸ ڈسمبر ۱۹۲۵ عیسوی

جناب صدرنشین صاحب استقبالیہ کمیٹی و خواتین و حضرات!

ابتدائی ریمارک

جب مجھ سے معتمد صاحب ایجوکیشنل کانفرنس نے اس اجلاس کی صدارت کے لئے فرمایا تو اولاً مجھے اس عزت کے قبول کرنے میں کسی قدر پس و پیش ہوا۔ لیکن جس اخلاق و کرم سے کمیٹی نے پیش قدمی فرمائی اس نے اور نیز اس خیال نے کہ شاید اس حیثیت سے مجھے تعلیم کی کچھ خدمت کرنے کا موقع حاصل ہو اس تامل کو دور کر دیا۔ آپ حضرات نے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے۔ میں اس کا شکرگزار ہوں۔ غالباً مجھے صدرنشین بنانے سے آپ حضرات کا یہ منشا ہے کہ میں مسئلہ تعلیم پر آپ کے خیالات کی ترجمانی کروں۔ یہ وہ عقدہ ہے جس کے حل کرنے میں دنیا کے بڑے بڑے ماہر فن تعلیمات منہمک ہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کی مجھ میں قابلیت نہیں ہے۔ میں غالباً آپ کو تو مطمئن نہ کر سکوں البتہ اس کی کوشش کروں گا کہ کم از کم میرا کانشنس و ضمیر مطمئن ہو جائے۔

تعزیت بہ پیشگاہ اعلیحضرت بندگانعالی

خطبہ صدارت شروع کرنے سے قبل میں دو امور کے متعلق آپ کی جانب سے آپ کے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا امر یہ ہے کہ آج ہماری کانفرنس پر رنج و الم کا بادل چھایا ہوا ہے۔ ہمارے بادشاہ فرمانروا کی

ایک عزیز دختر اس عالم فانی سے رحلت کر گئی ہیں آج تمام ریاست سوگ میں ہے۔ آج یہ
کانفرنس بھی اپنے فرائض انجام دیتے وقت حالت سوگ میں ہے ہم باری تعالیٰ سے
دعا مانگتے ہیں کہ اس پاک روح کو جس نے اس قفس جسمانی سے علیحدگی اختیار
کرلی ہے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ہم اللہ جل شانہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے
ہر دلعزیز تعلیم پرست و علم دوست بادشاہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نواب عماد الملک بہادر کو ڈاکٹری کی ڈگری ملنے پر اظہار اطمینان

دوسرا امر یہ ہے کہ یہ کانفرنس اس پر اظہار اطمینان دلی
کرتی ہے کہ پہلے شخص جس کو عثمانیہ یونیورسٹی نے
قانون کی ڈگری ڈاکٹریٹ عطا فرمائی وہ فرد فرید ہیں جنھوں نے تمام عمر تعلیم ہی کی
خدمت میں بسر کی جنھوں نے بحیثیت ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن اس ریاست کی
خدمت تقریباً بیس برس تک کی اور جنھوں نے اُن آئین اور درسگاہوں کا بیج
بویا جن کے ثمرے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ نواب عماد الملک بہادر ڈاکٹر آف لا
فی الحقیقت اس ڈگری کے مستحق ہیں۔

مسئلہ جس پر میں اس وقت بحث کرنا چاہتا ہوں

اب میں اپنے خطبہ کے اصل مضمون کی طرف
متوجہ ہوتا ہوں۔ میرے آج کے خطبہ کا اصل مضمون یہ ہوگا کہ ہم کو فی زمانہ کس نوعیت
اور کس طرز کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ میں ماہر فن تعلیم نہیں ہوں نہ مجھے طریقہ تعلیم
یا اس کے نصاب کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک بے فن اور ناواقف
شخص کے بحیثیت ایک ایسے شخص کے جس کی اولاد ہے اور بحیثیت اس شخص کے جس کو
مسئلہ طریقہ تعلیم سے جس کا اثر اس بر اعظم کے کروڑوں انسانوں کی ترقی و بہبود پر
پڑ رہا ہے کس قدر دلچسپی ہے طریقہ تعلیم کے متعلق میرے چند خیالات ہیں۔ آج

انھیں خیالات کو پیش کرنے کی غرض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں آپ کو کوئی نئی بات نہ ملے گی۔ یہ وہی خیالات ہیں جن کو ہندوستان کے ارباب حل وعقد بارہا از دل ظاہر کر رہے ہیں۔ اصلیت تو یہ ہے کہ سارا ملک انھیں خیالات کی جانب رفتہ رفتہ چلا جا رہا ہے۔ آج ان خیالات کے دُہرانے کی اگر کوئی وجہ و معقول عذر میں پیش کر سکتا ہوں تو اسی قدر ہے کہ وہ دہرانے کے قابل ہیں یہ خیالات دُہرانے کے بار بار کے متحمل ہیں۔ ان خیالات سے نہ صرف حیدرآباد کا بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ تعلیم وابستہ ہے (۳۳) کروڑ انسان اُن سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

تعلیمی پالیسی اور مسئلہ کا جزو اعظم

جو خیالات میرے پیش نظر ہیں وہ یہ ہیں کہ ہماری تعلیمی پالیسی و تنظیم کے ساخت اور ترکیب دینے میں ذیل کے تین اہم خیالات کو ہمیشہ غالب رہنا چاہیئے۔

اول خیال یہ ہے کہ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو ہماری زندگی بسر کرنے اور کسی قدر آرام سے بسر کرنے میں معاون ہو۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ ہماری تعلیم ایسی ہو کہ موجودہ افراد سے مقابلتاً بہتر افراد تیار ہو سکیں۔

تیسرا خیال یہ ہے کہ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو ہم کو اپنے ہم سایوں کے ساتھ امن و سکون و خوشی سے زندگی بسر کرنے میں مدد دے۔

مسئلہ تعلیم کو انھیں ہر سہ خیالات کا تابع رہنا چاہیئے۔ شاید آپ کو تعجب ہو کہ میں نے اپنے خطبہ کے ابتدا ہی میں اس مسئلہ کو کیسے مبہم اور غیر واضح طریقہ سے آپ کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اب ہر مسئلہ کو علیحدہ علیحدہ صراحت سے بیان کروں گا۔

اس وقت سعی وخلوص کا سوال نہیں ہی

جس شدت کے ساتھ ہندوستان میں آج تعلیم کی کوشش کیجارہی ہی اُس کے متعلق میرے خطبہ سے کہیں غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ چند امور کی وضاحت ابتدا ہی میں کردوں۔ ہماری ریاست اور ہندوستان میں جس خلوص وجوش کے ساتھ اشاعت تعلیم میں سعی بلیغ کیجارہی ہے اُس کی نسبت کچھ شک وشبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیمات کی سالانہ رپورٹ کو ملاحظہ کرنے سے اور نیز اُن واقعات پر سرسری نظر ڈالنے سے جن کا تذکرہ میں نے اس خطبہ کے اختتامی حصہ میں کیا ہے۔ یہ امر بخوبی واضح ہوسکتا ہی کہ خدا کے فضل اور حضرت بندگانعالی متعالی کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہاں تعلیم کس سرعت کے ساتھ قدم بڑھارہی ہی اور ہندوستان میں بھی صوبجات کے وزرائے تعلیم کی کوشش بلیغ پر نظر ڈالتے ہوے یہ امر بھی پوشیدہ نہ رہے گا کہ ناخواندہ طبقہ کو خواندہ طبقہ میں لانے کی کیا کیا جد وجہد ہورہی ہے۔ غرضکہ کیا حیدرآباد اور کیا ہندوستان دونوں جگہ تعلیم کو بڑھانے اور پھیلانے میں کوشش وخلوص کی کمی نہیں پایا

پھر مطلب کیا ہے؟

ہمارا مطلب یہ ہی کہ ہماری حالت ایک ایسے مریض کی ہی جو ایسے حکیم کے پاس جارہا ہی جس کی سچی ہمدردانہ کوشش وجانفشانی میں ذرا فرق نہ ہو ایسی صورت میں مریض یہ تبلانا چاہتا ہے کہ کانٹا کہاں چبھ رہا ہے یا یہ کہ جسم کے کن حصوں میں درد زیادہ ہے ہمارا مقصود صرف اس قدر ہی کہ ہم ان مقامات کی نشاندہی کردیں جن کے علاج کی اس وقت اشد ضرورت ہے میں صرف اسی حیثیت ونقطۂ نظر سے تعلیم کے مسئلہ پر آپ کی جانب سے اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہوں۔

میرے پہلے خیال کا کیا منشاء ہے

وہ پہلا خیال جس کا تابع میں تعلیمی پالسی کو کرنا چاہتا

ہوں یہ ہے کہ تعلیم ایسی ہو جس سے کسب معاش میں کسی قدر مدد ملے۔ اب میں اسکی
تشریح کروں گا۔ میرے مطلب کو سمجھنے کی غرض سے براہ کرم آپ ہندوستان کی
گزشتہ صد سالہ تاریخ تعلیم پر ایک سرسری نظر صرف ایک منٹ کے لئے ڈالیں
یہ ملحوظ رہے کہ ہماری ریاست کی تاریخ تعلیم ہند کی عام تاریخ تعلیم سے کچھ جدا
نہیں ہے بلکہ یہ بھی اسی عام تاریخ کا ایک جزو و باب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
قابل تحسین ہیں وہ انگریزی حکمراں جنھوں نے ایسی قابل ہستیوں کے اثرات سے
جیسے کہ لارڈ میکالے۔ لارڈ بنٹنک اور راجہ رام موہن رائے تھے۔ ایک
صدی ہوئی کہ رعایا کو تعلیم دینا گورنمنٹ کے فرائض میں داخل کر دیا۔ اس
اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد ۱۸۵۴ء میں انگلستان سے کورٹ آف ڈائرکٹرز
نے ہندوستان کے اپنے عہدہ داروں اور کار فرماؤں کے پاس ایک قابل
یادگار ہدایتی مراسلہ تعلیم کے متعلق روانہ کیا۔ ہمارا پرانا دیسی طریقۂ تعلیم یہ تھا
کہ خانگی درس گاہیں ہوتی تھیں جن کو سرکار سے بڑے بڑے عطیات بطور امداد
ملتے تھے۔ لیکن ۱۸۵۴ء سے گورنمنٹ نے اس امر کا اعلان صریح طور پر کر دیا کہ
وہ اس ملک کے باشندوں کی تعلیم کی ذمہ دار ہے۔ اسی وقت سے محکمہ تعلیمات
قائم ہوا اس کو حسن اتفاق کہئے یا یوں کہئے کہ ان خاص تعلقات کے نتائج
واثرات تھے جو کہ برٹش گورنمنٹ اور دیسی ریاستوں میں قائم ہیں کہ ریاست
حیدرآباد میں سرکاری تعلیم و اسٹیٹ ایجوکیشن کے سب سے پہلے احکام جو نافذ ہوے
ان کا سنہ و سال وہی ۱۸۵۴ء پڑتا ہے۔ اسی سنہ میں بلدۂ حیدرآباد میں
سرکار عالی کے حکم سے ایک مدرسہ قائم ہوا جس کو دارالعلوم کہتے ہیں ہندوستان

میں صیغہ تعلیمات سال بسال ترقی کرتا رہا اور حیدرآباد نے بھی اس کے نقش قدم پر
چلنے میں کوتاہی نہ کی۔ حیدرآباد نے کالج اور مدارس فوقانیہ مدراس یونیورسٹی سے
ملحق کردئے۔ نصاب تعلیم بھی وہی اختیار کیا گیا۔ امتحان بھی اسی قسم کے قائم ہوگئے
بالآخر برٹش انڈیا کا طریقہ تعلیم ایک نمونہ بن گیا۔ دیہات اور شہروں میں اسی
قسم کے تحتانی مدارس قایم ہوگئے۔ برطانیہ ہند کی طرز تعلیم کا اصل مقصد باشندگان
ہند کو خواندہ بنانا تھا۔ شہری اسکولوں اور کالجوں کا ایک مقصد اور بھی تھا
وہ یہ کہ انگریزی زبان بھی سکھائی جائے۔ یہ پالیسی بالکل نیک نیتی پر مبنی تھی
لہذا وہی طریقہ ہماری ریاست نے بھی اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم کو بھی مسئلہ
تعلیم کی انھیں مشکلات کا سامنا ہوگیا جن کا مقابلہ برٹش انڈیا کو کرنا ہے۔ ان
مشکلات کی نوعیت یہ ہے کہ کیا ہماری سابقہ طرز تعلیم نے ہماری موجودہ دولت
اور ذرائع آمدنی کو ترقی دینے میں کافی مدد کی ؟ جو تعلیم کہ ہم گزشتہ زمانہ میں
حاصل کرچکے کیا ہم کو اس سے اس جد و جہد میں ثابت قدم رہنے اور مقابلہ کرنے کی
قوت حاصل ہوگئی ہے۔ جس میں آج تمام بنی نوع انسان گرفتار ہیں اور جس کی
اہمیت دن رات اسی مناسبت سے بڑھتی جائے گی جس مناسبت سے ذرائع
نقل و حمل و رسل و رسائل میں ترقی ہوگی۔

قوموں اور فرقوں کی حیات کی اس کشمکش میں جو روزانہ نہایت سرعت
کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ ہم کس شمار قطار میں رہیں گے ؟ یا بالفاظ دیگر یوں
کہئے کہ ہم دنیا میں رہ بھی سکیں گے ؟ اور آرام سے رہ سکیں گے ؟ محض علمی
تعلیم جو اب تک ہم کو دی گئی ہے اس کے فوائد سے تو کوئی شخص انکار

کر نہیں سکتا۔ لیکن آج جبکہ مصر میں روئی کی قیمت کی کمی بیشی سے یا روس میں گیہوں کے نرخ کے آتار چڑھاؤ سے ہندوستان کی تجارتی منڈیوں پر اثر پڑجاتا ہے تو اس وقت مذکورۂ بالا قسم کے مسائل غور طلب ہو جاتے ہیں۔ جو سبق مجھ کو لندن کی ومبلی نمائش سے ۱۹۲۴ء میں حاصل ہوے ان میں سے ایک بہت بڑا سبق یہ تھا کہ اگر اسٹریلیا۔ کناڈا اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک فن زراعت میں اسی طرح ترقی کرتے رہے جیسا کہ نمائش میں دکھایا گیا تو ہم کو بہت جلد اپنی روئی مسکے اور شکر کے لئے انھیں نوآبادیوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑیگا۔ میں اُن فواید کو بھولنا نہیں چاہتا جو کہ ہند نے اُس تعلیم سے حاصل کئے ہیں جو اپنی صدسالہ سالگرہ منائے جانے کی مستحق ہو چکی۔ اس تعلیم نے باشندگان ہند کے دلوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور انکی آنکھیں ایک نئے طریقہ حکومت کی جانب کھول دی ہیں لیکن اس کی نوعیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کی غرض سے میں اس طریقہ تعلیم کے تمام نتایج و فوائد کو ایک جا جمع کر کے اس کو اقتصادی حالت کی کسوٹی سے پرکھنا چاہتا ہوں میں یہ امر دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ تعلیم نے ہم میں کوئی کتابی قابلیت پیدا کی یا موجودہ قابلیت کو قائم رکھنے میں مدد دی۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول پر اسکول اور کالج پر کالج یکے بعد دیگرے سرزمین ہند پر اس سرے سے اُس سرے تک قائم ہوتے رہے جن کا اصلی مقصد اسی قدر معلوم ہوتا تھا کہ بہت ایسے مٹری کولیٹ وگریجوئٹ پیدا ہو جائیں جو کہ انگلستان کے بہترین مقررین کا مقابلہ فصاحت میں کر سکیں اور اس کے بہترین

انشاپردازوں کا مقابلہ تحریریں کرسکیں۔ اس طرز تعلیم میں قوم کی اُن اصلی ضروریات کا لحاظ نہ رکھا گیا جس کو اس زندگی کے جدوجہد میں نہ صرف علمی لیاقت میں ترقی کرنا لازمی ہے بلکہ اپنی حیات کے قائم رکھنے کی غرض سے موجودہ دولت کا بڑھانا بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گریجوئٹ بمقابلہ نان گریجوئٹ کے روپیہ کی اکتسابی قوت زیادہ رکھتے تھے لیکن جو کچھ روپیہ اس طریقہ سے وہ حاصل کرسکے وہ وہی تھا جو اُن کے ہم وطنوں کے جیب میں پہلے سے موجود تھا خواہ گریجوئٹ صاحب نے سرکاری نوکری کرکے سرکاری خزانہ سے اپنی تنخواہ حاصل کی یا پیشہ وکالت میں خود اپنے عزیز واقارب میں مقدمہ بازیوں کی وجہ سے روپیہ حاصل کیا ہو یا کسی اور حیثیت سے پیدا کیا۔ ہر حالت میں روپیہ اپنے ہی ہم وطنوں کا تھا۔ جن علما کو اِس طریقہ تعلیم نے تیار کیا ان میں اُن پیشوں کی بہت کم قابلیت تھی جن سے ملک کی دولت میں اضافہ ہوا کرتا ہے۔

گزشتہ صدی میں اس ملک کی دولت اپنی جگہ سرعت سے بہت کچھ بدلتی رہی نیچے خاندان بلند ہوگئے۔ بلند خاندان نیچے آگئے۔ غربا امیر بنگئے اور امیر غریب ہوگئے۔ لیکن اس قسم کے انقلابات ہر ملک میں کسی نہ کسی طرح ہوتے ہی رہتے ہیں اس سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس قسم کے انقلابات کا نتیجہ صرف اسی قدر ہوا کرتا ہے کہ گویا ایک ہی کمرے کے ایک گوشہ سے خزانہ ہٹاکر دوسرے گوشہ میں رکھ دیا گیا۔ دولت میں اضافہ کرنے کی قوت تو درکنار ان تعلیم یافتہ افراد میں یہ بھی قوت نہ تھی کہ

جو دولت ملک کے باہر چلی جارہی تھی اس کو روک ہی سکتے۔ اب میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے اپنے پہلے خیال کی بابتہ یعنی یہ کہ ہم تعلیم ایسی چاہتے ہیں جس سے حصول معاش و کسب معیشت میں کسی قدر مدد ملے کافی صراحت کردی۔ میں اس قدیم طرز میں ایسی ترمیم و تبدیلی دیکھنا چاہتا ہوں جس سے ہمارے ملک کی دولت میں اضافہ ہوسکے یا قوم آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

پہلے خیال کے متعلق میری تجاویز کی نوعیت

میں یہ پہلے ہی بیان کرچکا ہوں کہ میں ایک ایسے مریض کی حیثیت سے گفتگو کروں گا جو اپنے امراض کی صرف نوعیت بیان کرنا چاہتا ہے مجھ کو اس کا اندیشہ ہے کہ اگر علاج بتانے کی کوشش کروں گا تو بڑے بڑے مدبران و ماہران فن تعلیم کے میدان میں گویا مداخلت بیجا کرنا ہوگا قسمت نے مجھے عدالتی ملازمت سے وابستہ کردیا ہے۔ مجھے ان میں سے کسی زمرہ میں بھی شرکت کا ادعا نہیں ہے لیکن بعض اوقات مریض جب ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو جوش میں آکر علاج کی ترکیبیں بھی بڑبڑانے لگتا ہے۔ اس خطبہ میں جس قدر تدابیر میں نے بتلائے ہیں انکی نوعیت صرف اشارات و کنایات کی سی ہے۔ اور وہ بھی ایسے شخص کے جو کہ اس فن میں ماہر نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ اُن میں کوئی تدبیر تعلیم کی موجودہ مشنری میں چسپاں کی جاسکے۔ اس میں غالباً بہت کچھ چھان بین و ردو بدل کی ضرورت ہے اور اس کام کے لئے نقادان و ماہران فن تعلیم کی ضرورت ہے
اس پہلے خیال کی تحت میرے ذہن میں جو تدابیر آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مسئلہ تعلیم دیہی

امور متعلق تعلیم دیہی

ہندوستان میں ہر جگہ دیہی آبادی شہری آبادی سے اپنی

بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہی۔ مثلاً ممالک محروسہ سرکار عالی ہی کو دیکھئے یہاں کی کل آبادی ایک کروڑ پچیس لاکھ ہے جس میں سے نوے فیصدی دیہات میں آباد ہیں یہ لوگ صدیوں سے امن وامان کے ساتھ زراعت میں مشغول ہیں ان کی ضروریات باشندگان شہر کی ضروریات سے بشیتر مختلف اور جداگانہ ہیں۔ ان کے مقاصد مذاق وخیالات ضروریات اور طرز معاشرت میں بھی فرق نظر آتا ہے بظاہر وہ دنیا کی سیاسی تحریکات سے بے خبر اور غیر متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بات توکم ازکم وہ ضرور محسوس کرنے لگے ہیں کہ روئی۔ اناج وغیرہ جو مال فروخت کے لئے وہ بازار لے جاتے ہیں اُن کی قیمتوں کا تعین نہ صرف پنجاب اور شمالی ہند کی قیمتوں کے بھاؤ کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے بلکہ بیرون ہند کی قیمتوں کے بھاؤ کا اثر اُن کے مال پر پڑ رہا ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ منڈی میں جاپانی انگریز اور امریکن اس کے مال کی قیمتیں لگا رہے ہیں۔ ممالک محروسہ کی نوے فیصدی آبادی کی یہی حالت ہے۔ اس طبقے کی تعلیم کے متعلق جو سوالات پیدا ہوتے ہیں اُنکی نوعیت کم و بیش حسب ذیل ہی۔ کیا اُنکی تعلیم ایسی ہونا چاہیئے جو ان کو زمین سی بمقابلہ قبل کے زیادہ وابستہ کردے یا اس تعلیم کی یہ خاصیت ہو کہ ان کا تعلق اراضی سے منقطع کردیوے ؟ کیا ہم اس پر اور زور دیں کہ بقول ماہران فن تعلیم "وہ تین آر" سے واقف ہوجائیں یعنے وہ لکھنا پڑھنا حساب سیکھ جائیں یا ان کو زراعت یا کاشتکاری کے عملی پہلو بتائے جائیں ؟ کیا ہم ان کو اس بے اطمینانی کی جانب لے چلیں جس کا اظہار روس جیسے زراعتی ملک میں بالشوزم کی صورت میں ہوا یہ بہتر ہوگا کہ ان کی طبیعتوں کو پیشہ کی طرف مائل کردیں اور یہ بتادیں کہ اُسی

قطعہ اراضی سے دونی مقدار غلہ کیونکر پیدا کی جاسکتی ہی اور اس طریقہ سے دنیا کے
مزارعین کا مقابلہ کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ یہی سوالات ہیں جو کہ حل طلب ہیں۔ ان کا
جواب اشد ضروری ہی کیونکہ تاخیر میں مضرت کا اندیشہ ہے۔ آج تختی بالکل صاف
ہی کل کہیں دھندلی نہ ہو جائے۔

ابھی تک ہم نے اس دیہی آبادی کے متعلق کوئی عام مستقل اسکیم و تجویز نہیں
تیار کی ہے۔ شہر اور دیہات میں ہم ایک ہی قسم کے تحتانیہ مدارس کھولتے رہے ہیں ہم نے
دیہی آبادی کے صرف حاشیہ پر ہاتھ لگایا ہے اور جہاں کہیں ہاتھ لگایا ہے اس کے
نتائج حوصلہ افزا نہیں دکھلائی دئے۔ اس کی مزید توضیح میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں
جس کو میرے ایک دوست نے جو کہ سرکار عالی کے مہتمم تعلیمات رہے ہیں مجھ سے چند روز
ہوے کہ بیان کیا وہ ایک مرتبہ کسی مدرسہ کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے تھے
ایک کسان اُن سے ملنے آیا اور اس نے جو تقریر کی اس کا مطلب یہ تھا "سرکار ہم
گانوں والوں کو آپ کے مدرسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کے مدرسہ کا
طفیل ہے کہ مجھے اپنے عزیز بیٹے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اُس نے آپ ہی کے مدرسہ میں
تعلیم پائی امتحان کامیاب کیا اور ملازمت کی تلاش میں مجھے چھوڑ کر چل دیا۔ اب
الٹی مجھے اس کی مدد کرنی پڑتی ہے نوکری میں تو اس کی یہ حالت ہے کہ پیٹ کو ہے تو
تن کو نہیں اور تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں اگر وہ یہاں ہوتا تو میرے کام میں ہاتھ بٹاتا
اور میری زندگی کا سہارا ہوتا" یہ اس کاشتکار کا خیال ہے جس کی تعلیم میں ہم اس قدر
روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ موجودہ تعلیم کسانوں میں ایک ایسا
خواندہ طبقہ تیار کر رہی ہے جن کو اپنے آبائی پیشہ زراعت سے رغبت باقی نہیں رہی

ریاست حیدرآباد کی گزشتہ مردم شماری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں فی ہزار ۹۲۷ اشخاص پیشہ زراعت اختیار کئے ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں انکی تعداد گھٹ کر ۵۵۵ رہ گئی۔ اس قسم کے واقعات سے میرے دل میں خوف پیدا ہوتا ہی ممکن ہے کہ خشک سالی طاعون اور دیگر وبائی امراض بھی اس کمی کا باعث ہوئے ہوں لیکن کوئی تعجب نہیں کہ رائج الوقت دیہی تعلیم کے باعث ایسی افراد کی تعداد بڑھتی جاے جو پیشہ کاشتکاری کو نظر حقارت سے دیکھیں۔ حاشا وکلاّ اگر سمیع اللہ کا یہ منشاء ہو کہ بنی نوع انسان میں سے نوے فیصدی یا یوں کہئے کہ اسکے ابنائے وطن میں سے نوے فیصدی یا اس سے بھی بڑھ کر یہ فرمائے کہ جو لوگ اُس کے گوشت پوست ہیں ان میں سے نوے فیصدی جاہل بنے رہیں لیکن سمیع اللہ کو اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ پیٹ کی مار اور سوزش جہالت کی مار اور سوزش سے بڑھی ہوی ہوا کرتی ہے۔ ہمارے ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ دیہی تعلیم کے موازنہ میں مزید اضافہ کرنا دشوار ہی اسلئے سب سے اہم سوال یہی ہے کہ جو رقم اس مد میں ہمیں دی جاتی ہے اس کا بہتر سے بہتر مصرف کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں جو خیالات میرے ذہن میں ہیں ان کو عرض کئے دیتا ہوں۔ میرا اشارہ اس جانب ہے کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو روپیہ ہم کو ملتا ہی اُس سے ہر تعلقہ میں ایک زراعتی مدرسہ کھول دیا جائے جس میں اچھے تخم۔ عمدہ کھاد آبپاشی اور کاشت کاری کے بہترین طریقوں کا استعمال اور اس کے مفید نتائج سکھائے جاویں اور جہاں تعلیم کے ہر شعبہ میں خواہ نقشہ کشی ہو۔ حساب ہو یا اور کوئی چیز ہو سب میں بالواسطہ یا بلا واسطہ فن زراعت وکاشتکاری کے اصول ملحوظ رکھے جائیں۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میرا کام صرف تجویز پیش کرنا ہے

اب رہی اسکیم کی تیاری یہ ماہرین فن کا کام ہے۔ میرا خیال ہو کہ اگر ہم تعلیم کے تصور و مفہوم کو وسیع کریں تو ہماری دیہی آبادی کا شمار بالکل غیر تعلیم یافتہ فرقہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ان پڑھ ہوں لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہزاروں سال کی تہذیب اور روایات ان کے دلوں پر نقش ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک ایسی سوسائٹی میں صلح پسندی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے جس کی بنیاد کو باوجود بیرونی حملوں اور مسلسل جنگ و جدل کشت و خون کے آج تک جنبش نہیں ہوی۔ ان لوگوں میں روحانیت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ زندگی کو اس قدر پاکیزہ خیال کرتے ہیں کہ چیونٹی اور مچھلی تو کیا سانپ جو بنی آدم کا جانی دشمن ہے۔ اُس کی پرورش کرنے کو بھی مستعد ہو جاتے ہیں۔ مجھے اپنے دیہات میں ایک ان پڑھ و جاہل مزدور کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ وہ تمام دن بھوکا رہ کر کام کرتا اور شام کو جو کچھ مزدوری اس کو ملتی گھر لیجاتا اپنے بال بچوں کی پرورش کرنے کے علاوہ اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کو بھی پالتا تھا۔ میں دوسرے ممالک کے بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص پر ایسے بے پڑھے مزدور کو بہ حیثیت انسان ترجیح دوں گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ناخواندہ ہیں مگر ایسے ناخواندہ ہیں کہ وہ جنگل میں جاتے ہیں اور اپنی روح کو پاک کرنے کیلئے جسم کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ اگر تعلیم کا مقصد انسان کو انسان بنانا ہی تو ایسے ناخواندہ لوگوں کا شمار بالکل غیر تعلیم یافتہ فرقہ میں نہیں ہو سکتا باوجود جہالت کے وہ موجودہ سوسائٹی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ان کی جہالت ایسی ڈراونی نہیں ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ موجودہ ہنگامۂ حیات میں انکی معاشی حالت

ابتر ہو جائے اور یہ حالت انکی جہالت سے زیادہ ڈراونی ہوگی۔ ہم بات دن
اخباروں میں شہروں کے ہنگاموں کے متعلق پڑھتے رہتے ہیں مگر یہ یاد
رکھنا چاہئے کہ اگر خدانخواستہ یہ بے چینی اور خلفشار دیہاتی نوے فیصدی
آبادی میں پیدا ہوگیا تو ان کے جذبات کے طوفان کے مقابلہ میں شہری
خلفشار کی کوئی حقیقت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ وہ ذرائع
دریافت کریں جن سے ہم ان کو قانع و خوش و خرم رکھ سکیں۔ ایسے اشخاص
کے لئے میں ان تحتانیہ مدرسوں کے اضافہ کرنے کی تائید کے لئے تیار نہیں
ہوں جن میں صرف تین "آر" کی تعلیم ہوتی ہے اور جن سے اُن کے پیشۂ
زراعت میں کما حقہ کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس وقت ہمارے شہروں اور دیہات
میں ایک ہی نمونے کے مدرسے ہیں جو تحتانیہ کہلاتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد
میں اس قسم کے تحتانیہ مدارس کی تعداد (۳۴۵۵) ہے جن میں (۲۰۱۶۰۳) طلبا
ہیں سنہ ۱۹۲۴ء م سنہ ۱۳۳۳ف میں ان کا سالانہ خرچ ([illegible]) روپیہ تھا۔
اس قدر اظہار واقعات کے بعد اب میں ارباب بصیرت کے روبرو جو مجھ سے بہتر
سمجھ سکتے ہیں یہ سوال کرنے کی جراءت کرتا ہوں کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ
دیہات کے لئے دوسرا طرز تعلیم اختیار کیا جائے کیونکہ انکی ضروریات و معاشرت
بالکل جداگانہ ہیں موازنہ تعلیمات کے دو حصے کئے جائیں۔ ایک دیہات کیلئے
اور دوسرا شہر کے لئے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان کے مدارس اسٹاف
اور اخراجات بالکل علیحدہ کردئے جائیں۔ ہمارا اس نوے فیصدی کی آبادی
کی ترقی و خوشحالی اور تعلیم کا نقطۂ نظر اس سے جداگانہ ہونا چاہیئے۔ جو کہ

بقیہ (۱۰) فی صدی شہری آبادی کے متعلق ہے۔

دیہاتیوں کی حقیقی ضروریات تین ہیں۔ ۱۔ کاشت کاری کا عمدہ طریقہ ۲۔ عمدہ صفائی۔ ۳۔ اور اجتماعی زندگی کے فواید کا بہتر علم۔

اس طبقہ کے طریقہ تعلیم کے متعلق ایک سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر مشاہدات کا طریقہ تعلیم اختیار کیا جائے تو کیا بہتر نتائج پیدا ہونا ممکن ہی ہیں؟ مثلاً صفائی کے متعلق اگر کوئی دورہ کرنے والا طبی اسٹاف جگہ جگہ پھر کر تصویروں اور نقشوں کے ذریعہ سے ان نقصانات کو بتلائے جو کہ چند جراثیم اور مچھر پہونچا سکتے ہیں جن کی پیدائش ان کے مکانوں کے قریب کوڑا اور جمع شدہ پانی سے ہوا کرتی ہے اس طریقہ سے حفظان صحت کے اصول اس سے زیادہ سمجھیں گے جو کہ ہندی اُردو یا مرہٹی کی ابتدائی کتابوں سے انکے سمجھ میں آتا ہے۔ رہا اجتماعی زندگی کے فوائد بتلانا انجمن اتحاد باہمی کی شاخیں اپنے کام کو وسیع کر سکتی ہیں۔ ان کو عملی طور پر اجتماعی زندگی کے فواید بتا سکتی ہیں۔ اگر طبابت۔ انجمن ہائے اتحاد باہمی اور زراعت کی وہ شاخیں جن سے تعلیمی کام لیا جا سکتا ہے دفتر تعلیمات کے تحت کردی جائیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مجھ کو اندیشہ ہی کہ اب میں جزئیات و تفصیلات کی طرف چلا جارہا ہوں جن میں پڑنا میرا منشا نہیں ہی۔ میرا مطمح نظر صرف یہی ہے کہ صاف طور سے یہ بتا دیا جائے کہ نوے فیصدی دیہاتی آبادی کو کس قسم کی تعلیم درکار ہے۔ اگر ایک دفعہ انکی معاشی حالت سدھر جائے تو غالباً جہالت کو وہ خود ہی اپنی محنت سے دور کرنے کی کوشش کرینگے اور اُن خانگی قدم

دیسی درس گاہوں میں جن کو کہ ہم مکتب اور پاٹ شالہ کہتے تھے جو کبھی کسی پیپل کے درخت کے نیچے ہوا کرتے تھے وہاں غالباً اس حد تک تو ضرور پڑھ جائینگے جتنا کہ "تین آر" "کے" ان موجودہ تحتانیہ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے جو کہ اس وقت مقابلتاً کثیر الصرف عمارات میں قائم ہیں اور جنکی نگرانی کیلئے نگرانکار مقرر کرنے پڑتے ہیں اور دیگر ضروری مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس رقم کا معتدبہ حصہ جو کہ دیسی درس گاہوں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں صرف کیا جا سکتا تھا اس قسم کے انتظامی امور میں لازماً خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ میں مکتبوں اور دیسی پاٹ شالوں کے امدادی اصول کو زیادہ پسند کرتا ہوں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہند کے انسانوں میں باہمی تعلقات و مدارج کی ترقی کسی فطرتی ارتقاء کی مدد سے ہو نہ کہ فوری ریوولیوشن یا انقلاب کے ذریعہ سے۔ اگر آپ ہندوستان کی نوے فیصدی دیہاتی آبادی میں بالشوزم کے ان خیالات کو پھیلانا نہیں چاہتے جن سے ہماری سوسائٹی کا شیرازہ و تنظیم پراگندہ و درہم و برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس طبقہ کے واسطے زراعت ہی بہترین پیشہ ہوگا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ راہ راست سے بھٹک کر کسی ٹیڑھے راستہ پر نہ پڑ جائیں تو میری ناچیز رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ دیہی تعلیم کے مسئلہ کو شہری تعلیم کے مسئلہ سے جدا کر دیا جائے اور اس بات کی کوشش کیجائے کہ نوے فیصدی زراعت پیشہ آبادی کو ہل چلانے ہی میں مشغول رکھا جائے لہذا نوے فیصدی آبادی کی حقیقی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ کو حل فرمائیے۔ اس مسئلہ کے حل کرنے

میں اس امر کا لحاظ رہے کہ انکی تعلیم کی ایسی نوعیت ہو جس سے ان کے آبائی پیشہ زراعت میں روز بروز ترقی آمدنی کے وسائل و ذرایع بڑھتے جائیں۔ انکی کمزوری ہماری کمزوری ہے۔ انکی ترقی ہماری ترقی ہے انکی فلاح و بہبودی میں ہماری خوش حالی مضمر ہے۔ انکی قوت ہماری قوت ہے۔ ہندوستانکی معاشی عمارت کی بنیاد انھیں پر قائم ہے۔ ہمارے موازنہ اخراجات کی وہی کفالت کرتے ہیں۔ انھیں سے ہمارے گنج آباد ہیں ان ہی سے ہمارے خزانہ معمور ہیں۔ قصہ کوتاہ ان کے واسطے ہم ایسی تعلیم چاہتے ہیں جس کی مدد سے وہ اپنی زندگی آرام سے بسر کرسکیں۔

(۲) شہری تعلیم کا مسئلہ

امور متعلقہ شہری و قصباتی تعلیم | اب میں شہری تعلیم کے مسئلہ پر اسی اقتصادی نقطہ نظر سے غور کروں گا یعنی یہ کہ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہئیے جس سے ہم آرام سے زندگی بسر کرنے کا طریقہ سیکھ لیں۔

شہری تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مدارس تحتانیہ۔ جہاں ایلی منٹری یعنے ابتدائی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔
۲۔ مدارس فوقانیہ یا ہائی اسکول جہاں ابتدائی سے اعلیٰ تر تعلیم دیجاتی ہی
۳۔ جامعہ یعنے یونیورسٹی۔ جہاں علوم کی تکمیل کیجاتی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ شہری تعلیم کی اسکیم اور تجاویز میں دستکاری اور صنعت و حرفت کا جزو اس سے بہت زیادہ ہونا چاہئیے جسقدر رکھا گیا ہے

ہندوستان کی ترقی کی موجودہ نوبت پر مجھے کسی ایسی تعلیم پر اعتقاد نہیں ہے جس کی ذمہ داری تو اسٹیٹ نے لی ہو لیکن جو کہ مفاد کسب معاش و ملازمت و تجارت کے خیالات سے منقطع و مُبرا ہو۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے تعلیم کا کچھ بھی [illegible] ہو لیکن ہر اسٹیٹ کو تعلیم کی معاشی حیثیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوا کرتا ہے کیونکہ بیکاری کے تمام خوفناک نتائج کا سامنا آخر سلطنت ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ شہروں میں تحتانیہ و وسطانیہ مدرسوں بلکہ کالجوں کی اب کچھ زیادہ کمی نہیں ہے۔ شمع علم سے ہر شہر و قصبہ منور کیا جا رہا ہے۔ اور علم کی روشنی ان مقامات پر بھی پڑ رہی ہے جہاں ابھی تک اس کی رسائی نہ تھی۔ لیکن کیا موجودہ تعلیم نے غربت و افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد دی؟ مجھے اپنی ملازمت کے موجودہ دوران میں تقریباً ہر روز ایک ایسا فرض انجام دینا پڑتا ہے جو نہایت تکلیف دہ اور میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے یہ فرض دوسروں کو مایوس کرنے کا ہے۔ میں ہر چند شیریں کلامی سے کام لیتا ہوں تاکہ انکے مایوس دلوں پر جہاں تک ممکن ہو چوٹ کے نشان کم پڑیں لیکن پھر بھی سوائے مایوس کرنے کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یہ بیچارے سرکاری ملازمت کے لئے مجھے درخواست دیتے ہیں لیکن مجھے انکی درخواستیں نامنظور کرنا لازمی ہے کیونکہ میرے پاس ایسی جائدادیں خالی نہیں ملتیں۔ ان میں بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے دفاتر کے حکام مجاز کو بھی اس قسم کا تجربہ آئے دن ہوا کرتا ہوگا۔ چونکہ ہندوستان

میں شہری تعلیم کا ایک ہی طرز ہے اس وجہ سے ہر جگہ ایک ہی قسم کے نتائج رونما ہو رہے ہیں۔ ریاست میسور میں ملازمین کے متعلق ایک رکروٹنگ بورڈ یعنے کمیٹی تقررات ملازمین سرکاری قائم کیا گیا ہے، جو قبل تقرر کرنے کے ہر امیدوار کی قابلیت کی چھان بین کرتا ہے۔ فی الجملہ یہ بورڈ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے بے جا رعایت کے موقع بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اس بورڈ نے یہ رپورٹ پیش کی ہے کہ (۴۵۰) بی اے اور (۵۱۷) ایف۔ اے اور (۲۷۰۸) اسکول لیونگ پاس طلبہ نے سرکاری ملازمت کے لئے درخواستیں پیش کیں۔ لیکن اُن کو ناکامیابی ہوی۔ کوئی بھی اسٹیٹ اپنی یونیورسٹی اور اسکول کے تمام کامیاب شدہ طلبہ کو کھپا نہیں سکتی۔ ان حالات میں سر بنرجی دیوان ریاست میسور نے اس امر کو بتاتے ہوے کہ نوجوانوں کو فن معدنیات تجارت اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ کانفرنس معاشیات میسور میں یہ فرمایا کہ" اس مسئلہ کا حل اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ اس نوجوان طبقہ کو ریاست کے زراعتی و تجارتی شعبوں میں لگا دیا جائے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کو سرکاری ملازمت کا خیال اپنے دماغ سے نکال ڈالنا چاہئے اور اپنے آپ کو اسی طرح سے نہ تیار کرنا چاہئے کہ سب کے سب صرف سرکاری ملازمت ہی کے قابل بنکر رہ جائیں۔ جہاں تک جلد یہ خیال ان کے دماغوں سے نکل جائے اتنا ہی ملک کے لئے بہتر ہے" یہ خیال ریاست میسور کے دیوان کا ہے کچھ تعجب نہیں اگر ہمارے معزز

صدر اعظم بہادر کو بھی ان میٹرک و بی اے کامیاب طلبا سے جو ہماری شہری درس گاہوں سے تعلیم پاکر ہر سال نکل رہے ہیں مخاطب ہو کر ایسی ہی نصیحت کرنی پڑے۔ چند روز کا ذکر ہے کہ میں نے ایک استاد کے لئے اشتہار دیا تھا اس قدر درخواستیں میرے پاس آئیں کہ اگر کسی ناخواندہ بٹلر یا باورچی کے لئے اشتہار دیا جاتا تو اتنی درخواستیں شاید وصول نہ ہوتیں۔ یہاں تک تو ملازمت کے حالات بیان کئے گئے۔ اب افلاس کو دیکھئے تمام ہندوستان میں خواہ دیسی ریاست ہو یا برٹش انڈیا ہر جگہ مفلسی چھائی ہوی ہے۔ اس وقت میں ملک کے ایسے لوگوں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں جو کہ تمام اندرونی حالات سے اسی طرح واقف ہیں جیسا کہ میں۔ وہ بتائیں کہ کیا میں اس میں مبالغہ کر رہا ہوں کہ ہندوستان کی سرزمین پر لاکھوں نفوس ایسے ہیں جو چوبیس گھنٹہ میں ایک وقت سے زیادہ کھانے کی مقدرت نہیں رکھتے جن میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ وبا قحط اور ان دوسری مصیبتوں کے تھپیڑوں کو برداشت کر سکیں جو کہ نیچر اور قدرت انسان کو وقتاً فوقتاً پہونچایا کرتی ہے۔ ذرا ہمارے غربا کے مکانوں کو جھانک کر اندر دیکھئے ان کے سامان کا شمار کیجئے اور پھر غور فرمائے کہ معمولی راحت و زندگی کے سامان کہاں تک ان کے گھروں میں ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو چارپائی پر سونے کی مقدرت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو موسم سرما کی ٹھنڈی رات میں ٹھٹھر رہے ہیں؟ کتنے معدے ایسے ہیں جو رات دن بیکار رہتے ہیں۔ ان میں ہضم کرنے کے لئے غذا ہی نہیں ہے۔ آپ بخوبی جانتے

اور سمجھتے ہیں کہ ان واقعات سے میری کیا مراد ہے۔ میں ریاست حیدرآباد کو
مخصوص نہیں کرتا میرا مطمح نظر تمام ہند ہے۔ بارہا حکومت ہند پر ہندوستانیوں
کے معاشی حالات کی مفصل تحقیقات کرنے کا زور دیا گیا۔ مجھے اس خیال سے
مسرت ہے کہ لارڈ ریڈنگ بہادر کی گورنمنٹ ایسی تحقیقات کئے جانے کی ہم خیال
ہی۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ کمیٹی غور و خوض کے نتائج شائع کرے گی تو ہمارے
ملک کی قعر غربت پر بجید روشنی پڑے گی۔ اگر یہی تعلیم کسی عمارت کے مشابہ ہے
جو کہ نظروں سے پنہاں اور زمین میں دبی رہا کرتی ہے لیکن پھر بھی تمام
عمارت کو سنبھالے رہتی ہے تو شہری تعلیم بنیاد کے اوپر کی وہ عمارت ہی جسکے
ذریعہ سے انسان کی راحتوں کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں ظاہرا چمک دمک
اور بیرونی نمائش کے وہ سامان آراستہ کئے جاتے ہیں جو کہ فی زمانہ تمدن کے لوازم
میں سے خیال کئے جاتے ہیں جس کا رعب و اثر غیر ملکی اشخاص پر پڑتا ہے
اور جس کی خاص بازاری قیمت اس لحاظ سے بھی ہے کہ مجالس بین الاقوام
ہر قوم کا ذہنی رتبہ و اعزاز قائم کرتے وقت ایسے تمدن سے بھی متاثر ہوا کرتے
ہیں لہذا قومی زندگی میں اس ظاہرا تمدن کا سامان مہیا کرنا بھی ضروری ہی
اس میں شک نہیں کہ اشاعت تعلیم کی اصلی و سچی کوششوں میں ریاست حیدرآباد
اگر برٹش انڈیا کے صوبہ جات سے بڑھی ہوی نہیں ہے تو پیچھے بھی نہیں ہے
اس ریاست نے ابتدائی تعلیم کو مفت کر دیا ہے۔ گزشتہ دس سال میں مصارف
تعلیمات ۱۸ لاکھ روپیہ سے بڑھ کر ۶۹ لاکھ ہو گئے ہیں۔ اسکی درس گاہیں
۵۳۴۶ سے بڑھ کر ۸۰۹۳ ہو گئی ہیں اور ان درس گاہوں میں طلباء

(۱۴۶۳۶۰) سے بڑھ کر ۳۱۹۰۵۲ ہو گئے ہیں۔ ریاست نے خاص اپنی ایک جامعہ یعنے یونیورسٹی قائم کی ہے۔ جس نے گزشتہ چار سال کے عرصہ میں ۹۷۸ نوجوانان ملک کو انٹرمیڈیٹ و بی اے و یم اے و ایل۔ ایل بی کی اسناد تقسیم کی ہیں۔ اسی یونیورسٹی کی زیر نگرانی سنہ ۱۳۲۷ف سے اب تک ۹۰۷ طلباء نے امتحان میٹرک کامیاب کیا ہے۔ مذکورۂ بالا اعداد میں اُن طلباء کا شمار نہیں جنھوں نے نظام کالج اور مدارس فوقانیہ ملحقہ مدراس یونیورسٹی سے کامیابی حاصل کی ہے۔ ہمارے پاس ایسے اعداد و شمار نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا کہ ان کامیاب طلباء کے منجملہ کس قدر طلباء کو ملازمتیں مل سکیں۔ لیکن میرے خیال میں جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے یہاں کی حالت بھی ریاست میسور اور برٹش انڈیا سے کچھ کم مایوس کن نہیں ہے مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر ان کو بامشاہرہ ملازمت نہ مل سکے تو کہیں ایک بلامشاہرہ ملازمت میں ٹھیک نہ ہو جائیں اور وہ ملازمت یہ ہے کہ ملک میں بے چینی پھیلانا جس سے ریاست کی جڑ کٹتی ہے اور جس کا مزا برٹش انڈیا چکھ چکی ہے۔ اس دنیا کی کوئی بھی حکومت اس تعلیم یافتہ گروہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کھپا نہیں سکتی۔ اس سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہماری ریاست بیکاری کے اہم مسئلہ سے آگاہ نہیں ہے اصلیت تو یہ ہے کہ ممالک محروسہ میں صنعت و حرفت کے مدارس کی تعداد بڑھانے کی کوشش میں دریغ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں مدارس صنعت و حرفت (۶) سے بڑھ کر (۹) اور طلبا کی تعداد (۵۹۰) سے بڑھ کر (۱۲۷۰) ہوگئی ہے ان کے مصارف بھی بہ مقابلہ (۱۵ہزار ۵سو روپیہ

کے (لولولہ) روپیہ ہے۔ ناظم صاحب دارالضرب کے زیر انتظام و نگرانی
ایک مدرسہ ہے جہاں فن تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ مسٹر شارپ متعلقہ سررشتہ
تعلیمات سرکار عظمت مدار نے برٹش انڈیا کے ساتویں پنجسالہ ریویو میں تعلیمی حالت
پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم کا
کوئی انتظام نہیں ہے۔ طلباء ممالک غیر کو بعطاے وظائف بھیجے جاتے ہیں
۳۳ کروڑ کی آبادی کے لئے برٹش انڈیا میں کل (۲۲۸) ایسے مدارس ہیں جہاں
صنعت و حرفت اور فنون کی بالکل ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے۔ ترقی کی رفتار
اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت سے لے کر اب تک تمام برٹش انڈیا میں
صرف ۷ یا ۸ جدید مدرسے صنعت و حرفت کی صرف ابتدائی تعلیم کے کھولے
گئے ہیں لہذا مقابلتاً حیدرآباد اسٹیٹ صنعت و حرفت کی تعلیم بڑھانے کی
کوشش اور سعی میں برٹش انڈیا سے کم نہیں رہی۔ لیکن جو بات میں کہنا چاہتا
ہوں وہ اور ہی ہے۔ صنعت و حرفت کی یہ تعلیم سمندر میں قطرہ کی حیثیت
رکھتی ہے اور (۶۹) لاکھ تعلیمی موازنہ میں اس کی نسبت بہت کم ہے۔ ریاست
کی کل ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے کل تعلیمی موازنہ میں زیادہ اضافہ کرنا کسی قدر
دشوار ہے لہذا جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ شہری تعلیم کی پوری
اسکیم اور ڈھانچا اس طرح سے الٹ پلٹ دیا جائے کہ جو لوگ اس تعلیم
کو حاصل کر کے میدان زندگی میں جونہی قدم رکھیں وہ سوسائٹی کے مفید ممبر
اور رکن ثابت ہوں جن کی خدمات کی فوری ضرورت ہے اور جن کو ملازمت
حاصل کرنے کے مواقع اس سے بہت زیادہ ہوں جو کہ موجودہ طریقہ تعلیم

انکے سامنے اس وقت پیش کر رہا ہے۔ پالیسی کو کلیتاً بدلنے کی ضرورت ہے۔ شہری تعلیم کا نقطہ نظر ہی دوسرا ہونا چاہیئے مثلاً اس وقت فوقانی یا ہائی اسکول کی تعلیم پر کل ملا کر ۲۵ لاکھ صرف ہوتے ہیں اور صنعت و حرفت کے مدرسہ پر ایک لاکھ صرف ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسئلہ غور طلب یہ ہے کہ کیا مصارف کا پلہ اِدھر سے اُدھر بدلا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ صنعت و حرفت کی تعلیم ہی کل فوقانی تعلیم کی نوعیت قرار دیدی جاوے۔

فوقانی و یونیورسٹی کی تعلیم میں فرق یہ امر بھی ضروری ہے کہ فوقانی تعلیم اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں فرق اور امتیاز رکھا جائے کیونکہ ان کے زاویۂ نگاہ بالکل مختلف اور جداگانہ ہیں۔ کم از کم ملک کے موجودہ حالات کے لحاظ سے اس وقت تو علیحدہ رہنا چاہیئے۔ ثانوی یا فوقانیہ مدارس کی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ شہر کا ہر باشندہ کسی نہ کسی پیشہ میں داخل ہونے کی قابلیت حاصل کر لیوے۔ خواہ وہ پیشہ دست کاری۔ مصوری۔ نقاشی۔ معماری۔ باورچی۔ نجاری موچی۔ سناری۔ دندانسازی یا معلمی کا ہو یا کوئی اور پیشہ ہو جس کی ضرورت سوسائٹی کو ہوا کرتی ہے۔ جس قدر اضافہ ایسے لوگوں کی تعداد میں ہوتا جائیگا اُسی حد تک بیکاری کا مسئلہ بھی حل ہوتا جائے گا۔ فوقانی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ تعلیم مختلف اقسام کی ہو اور متعدد لوگوں کو دی جائے۔ اسکا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ حصول ملازمت یا کسب معاش کے تمام ذرائع پر نگاہ رہے اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی پیشہ کی تعلیم بقدر اسکی عقل و موزونی طبع کے دیجاوے۔ اس کا مقصد یہ ہونا

چاہیئے کہ اپنے دائرہ واحاطہ اثر میں اُن تمام مختلف مدارج کے سمجھ وعقل کے لوگوں کو شامل کرلے جو کہ جامعہ یا یونیورسٹی کی تعلیم کے قابل نہیں ہیں۔ کتابی یا ادبی تعلیم اس دائرے سے باہر نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ بھی نہ ہو کہ اس دائرے میں سوائے کتابی وادبی تعلیم کے کچھ نہ دکھائی دیوے۔ جیسی کہ اس وقت صورت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ نصب العین کم از کم اس فوقانی تعلیم کا ضرور ہونا چاہیئے جس کے اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ البتہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد دوسرا ہونا چاہیئے۔ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اشخاص کو ہر سائنس اور شعبہ علم کے بہترین واعلیٰ ترین واشرف ترین مقصد کا نمونہ بنکر نکلنا چاہیئے یونیورسٹی کو تعداد پر اس قدر زور نہ دینا چاہیئے جیسا کہ اپنے ایلمنائی و گراجوئٹس کے اوصاف اور قابلیت کو مکمل کرنے میں جب کبھی یونیورسٹی اس کی کوشش کریگی کہ اس کے ایلمنائی و گراجوئٹس کی تعداد بہت بڑھ جاوے تو انکی اس قابلیت کا معیار بھی ضرور گر جائیگا جس کا قائم رکھنا یونیورسٹی کا فرض ہی یونیورسٹی یا جامعہ کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ ایسے اشخاص پیدا کرے جو ملک کے تمام باشندوں و ہم وطنوں کو خواہ وہ دیہات میں رہتے ہوں یا شہروں میں اپنے خیالات ومعلومات سے مسخر کرکے اپنے قابو میں رکھیں۔ یونیورسٹی کے تیار کردہ اشخاص ایسے ہونے چاہئیں جو اپنے علم وقابلیت کے زور سے ایک ایسی عام پالیسی کا اعلان رسوخ سے کرسکیں جس کی پابندی عوام کو کرنا چاہیئے۔ ان کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں بہترین نصب العین پیش کرسکیں جس کی تقلید کرنے کو سب تیار ہو جائیں۔ اُس کی مثال یہ ہی کہ اگر کسی عمارت

کے تیار کرنے میں بہت سے فوقانی تعلیم یافتہ اشخاص کے دست و پا و سمجھ و دماغ
کی ضرورت ہے تو یونیورسٹی تعلیم یافتہ کا ایک ہی دماغ اس کل عمارت کے
خاکے اور نقشے و ڈیزائن کے تیار کرنے میں کافی سمجھا جاوے۔ یونیورسٹی کا
ایک ایک فرد اپنے اپنے خاص فن میں ایسے خیالات رکھتا ہو کہ ملک کے تمام
تمدنی اور معاشی ڈھانچے میں وہ خیالات سرایت کر سکیں۔ ایک زمانہ تھا کہ
سارا یورپ یونانی فلسفہ کے باریک فقیہانہ مباحث کا معتقد تھا۔ لیکن ولایت
کی ایک یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ شخص لارڈ بیکن نے اس فلسفہ کی تمام بنیاد کو
ہلا دیا اور اس کی جگہ ایسا فلسفہ قائم کیا جس کا نام لارڈ میکالے نے اکسپرمینٹل
فلاسفی رکھا ہے یعنے وہ فلسفہ جس کی بناء مشاہدات و تجربات عالم پر ہے
یہ وہی فلسفہ ہے جس نے تمام یورپ کے دلوں کو مسخر کر لیا اور بالآخر ان علوم
اور سائینسز کی بنیاد ڈالی جس نے مشرق اور مغرب میں اس قدر فرق پیدا
کر دیا ہے۔ ان وجوہ سے اس پالیسی کے قائم کرنے میں اسٹیٹ کی غرض
بھی شامل ہے کہ جو طلباء یونیورسٹی میں داخل کئے جائیں وہ فوقانی تعلیم یافتہ
طلباء میں سے منتخب و ممتاز افراد ہوں۔ جب یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا
تب ہی مفید مطلب نتائج ظہور میں آئینگے۔ لہذا اگر ہم کوئی پالیسی یا واجب العمل
تعلیمی اصول قرار دینا چاہتے ہیں تو ہم کو فوقانی اسکولوں اور یونیورسٹی
کے تعلیمی مقاصد کی بابتہ ابھی سے اپنے ذہن میں کوئی سمجھوتہ یا تصور قائم
کر لینا چاہئے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ سرچشمہ علم کو بند کر دیا جائے
یا اس کی روانی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر دی جائے۔ یہ تو تعلیم کے

متعلق تقسیم کار کا سوال ہی نہ علم کے مسدود کرنے کا۔ جب کبھی ہم یونیورسٹی کی
تعلیم پر ایک خاص مناسبت سے زیادہ صرف کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ
یہ ہوگا کہ ہم قوم کے چند افراد کو فوقانی تعلیم سے ضرور محروم کردیں گے جنکے
لئے دوسری مد میں زاید صرف ہو جانے کی وجہ سے ہم کوئی انتظام نہ کرسکے
اور اگر فوقانی تعلیم پر ایک خاص مناسبت سے زیادہ صرف کریں گے تو
نتیجہ بھی برعکس ہو جائے گا۔ اسی طرح سے اگر ہم یونیورسٹی تعلیم کا معیار ہر مدارج
کے ذہن و عقل کے طلباء کی سہولت کے لئے جو یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتے
ہیں گرادیں گے تو یونیورسٹی اس کامل و اعلیٰ ترین درجہ کی تعلیم بھی نہ دے
سکے گی جس کی ضرورت ہم کو اپنے قومی اغراض کے لئے ہر شعبہ زندگی میں
اس وقت ہے خواہ وہ شعبہ سیاسی ہو انتظامی ہو یا تعلیمی ہندوستان کے
ایک مشہور سائنس داں فرد جیسے سر جگدیس بوس کی قابلیت و معلومات سے
جو فائدہ ملک کو پہونچتا ہے اور جو عزت ملک کی مجلس بین الاقوام کی نگاہوں
میں بڑھتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو سیکڑوں ایسے بی ایس سی
ڈگری یافتہ کی مدد سے ممکن ہے جو سائنس کی ڈگریاں لے کر اپنی تمام عمر
کسی دفتر کی اہلکاری میں ضائع کرنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔ ہماری
قومی زندگی کے موجودہ حالت میں اس قسم کے طلبا پر جس قدر وقت و
محنت و روپیہ یونیورسٹی صرف کرتی ہے اس کو میں اسراف سمجھتا ہوں
اس امر کی بابت کہ فوقانی تعلیم کی نوعیت کیا ہونا چاہئے اور یونیورسٹی
کی تعلیم کس نوعیت و پایہ کی ہونا چاہئے ایک مستقل رائے ضرور قائم کرنا

چاہئے اور پھر اسی پر عمل کیا جاوے۔ مخصوص جبکہ ہماری خواہش یہ ہے کہ
جو اشخاص نیچے مدارج پر ہیں۔ اُن میں کا ہر فرد اکتساب دولت میں مصروف
پایا جائے۔ اور ہر شخص جو بلند مدارج پر ہے وہ ایسا ہو جس میں غور۔ فکر
کام اور حکومت کرنے کی قابلیت موجود ہو۔ فرض کیجئے کہ ہم عثمانیہ یونیورسٹی
سے شعبہ علوم و فنون کے گرائجوئٹس ایک بڑی تعداد و مقدار سے نکالنا
شروع کریں جن کی غرض و مقصد اس زندگی میں اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ
ان کو کوئی سرکاری جگہ مل جاوے تو نتائج ایسے ہی مایوس کن ہوں گے
جیسے کہ برٹش انڈیا میں ہوے ہیں۔ پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ شہری
تعلیم کے مختلف مدارج میں ایک طرح کا اتحاد اور لگاؤ ہو۔ کسی یونیورسٹی
کی تعلیم اُس وقت تک بارآور اور کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ہونہار
طالب علموں کا مواد اس کو نہ دیا جائے۔ غرض یہ کہ شہری تعلیم کی کل اسکیم
اور ڈھانچہ شروع سے آخر تک مسلسل زنجیر کی صورت میں ہونا چاہئے
اس کل زنجیر میں ایک ہی مقصد نمایاں ہو۔ ایک ہی نصب العین ظاہر ہوتا
ہو۔ وہ مقصد وہ نصب العین یہ ہے کہ ہر انسان کو مفید اور کارآمد بنایا جائے
مفید اور کارآمد اپنے لئے ہو۔ مفید اور کارآمد ملک کے لئے ہو اور ایسا نہ ہو
کہ صرف پڑھنے کی کچھ قابلیت حاصل کرکے وہ دنیا کے سمندر بے پایاں
میں بھٹکتا پھرے۔

تدابیر تبلانے کی کوشش | میں نہ اس قابل ہوں اور نہ یہ کوئی موقع ہے کہ اپنے
ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شہری تعلیم کی کوئی خاص اسکیم

بتاکر پیش کروں۔ البتہ مشورہ کے طور پر آپ حضرات سے چند موٹی موٹی باتیں بطور تجویز عرض کرتا ہوں سب سے پہلے ایلی منٹری یعنے ابتدائی تعلیم کو لیجئے۔ لندن کے بورڈ آف ایجوکیشن نے سنہ ۱۹۱۰ء میں ابتدائی مدارس کیلئے دستکاری کے تعلیم کی ایک خاص اسکیم تیار کی تھی۔ جس میں غالباً اس وقت تک بہت کچھ ترمیم و اضافہ ہو چکا ہوگا۔ ایک مدلل رپورٹ لکھنے کے بعد جس رائے کا اظہار اس بورڈ نے بطور نتیجہ کے آخری حصہ میں کیا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

(۱) "ہمارے خیال میں ہر ابتدائی مدرسہ کے نصاب میں دستکاری کو شامل کر دینا بہت اہم و ضروری ہے یہ صحیح ہے کہ اس وقت اس کو لازمی قرار دینے میں دشواریاں محسوس ہو رہی ہیں۔ پھر بھی اس خیال کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کرنی واجب ہے۔"

(۲) "ہماری رائے میں تمام مدارج کے مدرسوں میں یعنے انفنٹ کلاس و بچوں کی جماعت سے لے کر اسکول کی اوپر کی جماعتوں تک دستکاری کا ایسا مسلسل اور ترقی پذیر نصاب تجویز کرنا چاہئے کہ در اصل وہ ایک طریقہ تعلیم معلوم ہونے لگے اور یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی جدید مضمون ہے جو نصاب میں داخل کیا جا رہا ہے۔"

(۳) "ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ اساتذہ کی بڑی تعداد دستکاری سے نابلد ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس قسم کے طریقہ تعلیم کو جاری کرنے میں تاخیر کریں۔ بہرحال ہم یہ مناسب اور ضروری

خیال کرتے ہیں کہ آیندہ سے تمام اساتذہ کے لئے دستکاری کی تعلیم حاصل کرنا ایک لازمی شرط قرار دیدی جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسی فریدیں بہم پہونچائی جائیں کہ موجودہ مدرس بھی اس طریقہ تعلیم سے بہرہ ور ہوسکیں"

(۴) "ہمارے خیال میں بہترین نظام تعلیم وہی ہوسکتا ہے جس کی رو سے ہر قسم کے دستکاری کی تعلیم مدرسوں ہی میں معمولی مدرسین کے ذریعہ سے دی جائے اور ہر اسکول میں ایسی گنجایش و وسعت رکھی جاوے کہ ایک کمرہ اس کام کے لئے مخصوص کیا جاسکے۔ دست کاری کے مرکزی مقامات پر اس وقت جو کام ہورہے ہیں اگرچہ وہ بہت پسندیدہ اور قابل قدر ہیں لیکن ہماری رائے میں بہت سی تدابیر ایسی ممکن ہیں کہ ان مدارس اور دست کاری کے مرکزوں میں تعلق و اتحاد پیدا کیا جاسکے"

(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷ فقرہ ۵)

اس کے دو برس بعد فبروری ۱۹۱۲ء میں لندن کونٹی کونسل کی تعلیمی کمیٹی نے ماہرین فن تعلیم کے کانفرنس کی وہ رپورٹ شائع کی جو صرف اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ لندن کے مدارس ابتدائی کے لئے دستکاری کے طریقہ اور تدابیر معلوم کئے جاویں۔ اس کانفرنس نے بھی ایک مدلل رپورٹ شائع کی اور وہ طریقے بتلائے جن کے اختیار کرنے سے دستکاری کے مضامین اسکولوں کے موجودہ نصاب میں کیونکر چسپاں کئے جاسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ان سب تدابیر کی نقل اس خطبہ میں نہیں کرسکتا۔ لیکن کانفرنس مذکور کی رپورٹ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے ماہرین فن تعلیم ابتدائی

وفوقانی مدارس کی تعلیم کو کس نقطہ نظر سے اب دیکھ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے
کہ اب وہ ایسی تعلیم کے قابل نہیں ہے جو صرف قوت حافظہ کی مدد سے
حاصل کی جاتی ہے۔ اغراض تعلیم کے لئے وہ لڑکے کے صرف قوائے ذہنی پر
بھروسہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس پر تلے ہوے معلوم ہوتے ہیں کہ جہاں
تک ممکن ہو تعلیمی مقاصد کے لئے لڑکوں کے ہاتھوں اور حواس خمسہ سے
روز بروز زیادہ کام لیا جائے۔ رپورٹ مذکور میں جو تجاویز پیش کیگئی
ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اقسام کی صنعت وحرفت پر
حاوی ہیں جو کہ ان کے ملک میں اس وقت موجود ہیں اور جس کے ابتدائی
اصولوں کو انھوں نے تحتانی مدارس کے نصاب میں اب بالکل لازمی مضمون
قرار دیدیا ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ محض الفاظ کو رٹنے اور جملوں کو ازبر
کر لینے سے لڑکے کو اس قدر تربیت نہیں حاصل ہوتی جیسا کہ دماغی کوشش
کے ساتھ ساتھ حواس خمسہ کی مدد شامل کر لینے سے ممکن ہے۔ ان کا خیال
ہے کہ دستکاری ہی سے ان کی دماغی قوت بڑھے گی ایک مقام پر اُن کا
ایک فقرہ بہت قابل غور ہے اس کا بھی ترجمہ کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ
"زمانہ کی ترقی کی یہ بیّن دلیل ہے کہ آج کل والدین۔ اخبارات پبلک
اور اہل ہنر کا ملازم رکھنے والا طبقہ ان سب کی ایک ہی استدعا معلوم ہوتی
ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑکوں کی تعلیم وتربیت ایسی ہونی چاہئے کہ مدرسہ
چھوڑتے ہی بلا تکلف کاروبار میں مصروف ہو جائیں"
رپورٹ کے اس فقرہ سے آپ کو اس کا اندازہ ہو گا کہ بڑے بڑے

ماہرین فن تعلیم صنعت و حرفت کو ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شامل کر دینا ضروری خیال کر رہے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں سے ان حضرات کو بہت مدد ملے گی جو اس ملک کی تحتانی و ابتدائی تعلیم کے مسائل حل کرنے میں مشغول ہیں۔ اب رہا سکنڈری یا ہائی اسکول کی تعلیم کا مسئلہ۔ میرا خیال ہے کہ فوقانی تعلیم کا جو طریقہ جرمنی میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ ہر ہائی اسکول میں عموماً کوئی نہ کوئی پیشہ سکھایا جاتا ہے ان اسکولوں کو ووکیشنل اسکول کہتے ہیں یہ پیشہ خواہ مصوری۔ نعل بندی۔ چابک سواری کفش دوزی۔ بالوں کی چوٹیاں تیار کرنا۔ باورچی گری یا موسیقی یا اور کچھ ہو مگر طالب العلم کو کسی نہ کسی پیشہ کے لئے تیار کرنا وہ ہائی اسکول کا فرض سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمام یورپ بمقابلہ ہمارے ملک کے لیبر یعنے محنت مزدوری و عمل کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں ان پیشوں کے اختیار کرنے میں پیشہ ور پر کسی ذلت کا دھبہ نہیں لگنے پاتا۔ بہرکیف میری رائے یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ایسے فوقانی مدارس میں اضافہ کیا جائے جن کا مقصد صرف زبان کا سکھا دینا ہو یا بجائے اس کے موجودہ مدارس انٹرمیڈیٹ کالج بنائے جائیں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ جرمنی کی طرح ہر فوقانی اسکول میں کوئی نہ کوئی پیشہ سکھایا جاوے۔ قوم کے لئے یہی زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ میں جزئیات نہیں بیان کر سکتا۔ صرف اشارتاً غور کی غرض سے اس قسم کی تجاویز پیش کرتا ہوں۔ یہ کام ماہرین فن کی کمیٹی کا ہوگا۔

کہ محض علمی تعلیم کے نصاب میں تعلیم پیشہ کا نصاب موجودہ فوقانی مدارس میں
کیونکر چسپاں کریں۔ اب آخر میں یونیورسٹی تعلیم کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ میں
اس امر کے متعلق اظہار رائے کر چکا کہ تعلیم یونیورسٹی یعنے جامعہ کا نصب العین
کیا ہونا چاہئے میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس کا مقصد کمال قابلیت حاصل
کرنا ہے نہ کہ طلباء کی تعداد کا بڑھانا اس وقت ہماری تعلیمی عمارت کا اوپری
حصہ زیادہ گراں بار اور بھاری معلوم ہو رہا ہے فوقانی تعلیم کے مقابلہ میں
یونیورسٹی کی تعلیم پر زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ اگر فوقانی و یونیورسٹی
کی تعلیم کے مقاصد کے متعلق میری متذکرہ بالا رائے قابل قبول قرار پائے
تو ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں کی تعلیم کے معیار و نوعیت میں بڑی
بڑی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی خواہ وہ یونیورسٹی برٹش انڈیا میں واقع
ہو یا کسی ریاست میں۔ جہاں تک ریاست حیدرآباد کا تعلق ہے میں صرف
ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس برس میں
یہ ریاست مستحقین اہل ملک کو ممالک غیر میں اور نیز برٹش انڈیا کے یونیورسٹیز
میں بھیجکر اور بذریعہ معقول وظائف امداد دے کر انکے تعلیم میں معتدبہ رقم
صرف کر رہی ہے۔ علم کے مختلف شعبوں کے لئے وہ بھیجے جاتے ہیں اس میں
شک نہیں ہے کہ کچھ زمانہ سے کمیٹی وظائف طلباء اس امر پر اپنی خاص توجہ
مبذول کر رہی ہے کہ جو طلباء ممالک غیر میں حصول علم کے لئے بھیجے جائیں
وہ ایسے ہوں جو ملک کے اقتصادی حالت درست کرنے میں مدد دیویں
اور جن کو کسی نہ کسی قسم کے فن کی تعلیم دلائی جائے پھر بھی یہ بہتر ہوگا کہ

اگر اس طریقہ عمل کو ایک ایسے مستحکم ضابطہ و قاعدہ کا جامہ پہنا دیا جائے جسکی وجہ سے
بیرونی ممالک میں تعلیم کی غرض سے کوئی وظیفہ صرف ایسے علمی پیشوں
کے واسطے نہ دیا جائے جیسے کہ قانون یا فلسفہ وغیرہ ۔ میری اس رائے کی
وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ علوم بے کار ہیں بلکہ یہ وجہ ہے کہ اب اُن مضامین
کی تعلیم دلانا زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے جنکی تعلیم پر آج تک چنداں لحاظ
وخیال نہیں کیا گیا ۔ سرکاری خزانہ کا روپیہ اس قسم کے طلبا پر صرف کرنا
اگر جائز ہو سکتا ہے تو صرف اسی وجہ سے کہ یہ طلبا ، اس نوعیت کی تعلیم
کی غرض سے بیرون ملک بھیجے جا رہے ہیں جس کا حاصل کرنا اس ملک میں
محال ہے ۔ قانون تو ایسا علم ہے جس کا حاصل کرنا اس ملک میں بھی ممکن ہے
یعنے اس وقت بڑی مسرت ہوگی جب ریاست حیدرآباد سے صرف اس
قابلیت کے طلبا ، بھیجے جاویں جو واپس آنے کے بعد دریائے کرشنا و گوداوری
کے کنارے ہماری ریاست کی سرزمین پر ایسے کارخانے بتلی گھر قائم کریں
جس کے دھویں کے دَل بادل سبزہ زاروں پر سے جھومتے ہوئے گزر کر ہمارے اننت
کی چوٹیوں میں غائب ہو جائیں وہاں ہماری عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجوئیٹ
کمر باندھے آستینیں چڑھائے سرگرمی سے مشغول ہو کر ملک کی دولت میں
اضافہ کریں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اس قسم کی تعلیم کا تصور میرے دماغ میں
بھرا ہوا ہے ۔ زمانہ کہہ رہا ہے کہ اس وقت ہم کو صرف ہندوستان کے مختلف
صوبوں سے مقابلہ کرنا نہیں ہے بلکہ دنیا سے مقابلہ کرنا ہے ۔ دیگر ممالک میں
جو ترقی مشین اور کلوں کی مدد سے ہو رہی ہے ۔ اوسکی برابری ہمارے ہاتھ نہیں

کر سکتے۔ کسی ملک کی اقتصادی غلامی سیاسی غلامی سے بدتر ہوا کرتی ہے
اقتصادی غلامی سے ملک کا ہر باشندہ متاثر ہوا کرتا ہے لیکن سیاسی غلامی
میں یہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں چند ہی وہ اشخاص متاثر ہوں جو کہ
چوٹی پر متمکن ہیں اور جن کو دیگر بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا شوق و جذبہ ہے
میں یہ چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں ہر یونیورسٹی ہماری مدد کرے اور ملک کو
اقتصادی غلامی سے آزاد کرائے۔ جب یہ صورت پیدا ہوگی تب ہی ہم خوشی
اور اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

۴۔ مسئلہ تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کی اہمیت | اگر اناث و ذکور کی تعداد مساوی قیاس کی جائے تو مسئلہ تعلیم
نسواں کا اثر ہندوستان کی نصف آبادی پر پڑتا ہے۔ اپنی اہمیت اور نتائج
کے لحاظ سے یہ مسئلہ لڑکوں کی تعلیم کے مسئلہ سے کم نہیں ہے۔ ہندوستان کا
ہر بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی مادرِ ہند کا ایک سرمایہ ہے۔ ہر روح جو کہ ایک
عورت کے جسم میں مقید ہے۔ ہندوستان کی ترقی یا تنزل کا باعث اسی طرح
سے ہو سکتی ہے جیسے کہ وہ روح جو کہ ایسے جسم میں مقید ہے جس کی ظاہری
شکل و صورت مرد کی بنائی گئی ہے۔ لڑکیوں کے والدین نے غالباً ابھی تک
اس امر کو محسوس نہیں کیا ہے کہ ہندوستان کے تمدن میں عورت کا کیا رتبہ ہے
موجودہ تعلیم نسواں کی نوعیت اور اسکے اثرات | ہماری یہ لاعلمی تو قابل افسوس تھی ہی
لیکن اس سے زیادہ قابل افسوس اس تعلیم کی نوعیت ہے جس کا انتظام اس

وقت تک ہم نے اپنی لڑکیوں کے لئے کر رکھا ہے۔ والدین کو اپنی لڑکیوں کیلئے سوائے موجودہ درسگاہوں میں بھیجنے کے کوئی چارہ نہیں ہے لیکن ان درسگاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سینیر یا جونیر کیمبرج کا امتحان یا میٹرکیولیشن و اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کا امتحان یا انٹرمیڈیٹ و بی اے و یم اے کا امتحان پاس کریں اور کبھی تو ایل ایل بی امتحان کیلئے بھی تیار کی جاتی ہیں۔ میری رائے میں یہ تعلیم ہماری لڑکیوں کے لئے کم ازکم اس وقت موزوں نہیں ہے۔ اگر موجودہ امتحانوں کی مارنے ہمارے لڑکوں کی تندرستی کی وہ حالت پہنچا دی ہے جس کو ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں تو اس خیال سے مجھ کو لرزہ آتا ہے کہ ایسے امتحانوں کا آخری نتیجہ ہماری لڑکیوں کی صحت جسمانی کے لئے کیا ہوگا۔ قدرت کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی قوتیں چند خاص محدود اغراض کے لئے بہت کچھ محفوظ رہیں لیکن ان کے موجودہ طریقہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی وہ قوتیں اپنے دماغوں کو ایسے فقرات والفاظ کے بھرنے کی کوشش میں بہت کچھ ضائع ہو جاتی ہیں جو کہ فرائض خانہ داری و فرائض مادری کے ادا کرنے کے وقت ان کے کچھ کام نہیں آتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ تعلیم نسواں کی علت غائی کیا ہے؟ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑکوں کا کاونٹر پارٹ یعنی مثنیٰ و نقل بن جائیں اگر یہ غرض ہے تو ملک کی معاشی زندگی میں کچھ بھی تقسیم کار نہ ہوا۔ لڑکی بھی کتابوں اور سیاسیات و قانون میں مثل لڑکوں کے پڑ جائیگی۔ پھر کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ انگریزی لڑکیوں کی جواب ہوں؟ لیکن جب اصل انگریزی

لڑکی ہندوستانی شوہر کے موزوں نہیں تو پھر اس کی نقل کیا کام دے گی۔ چند باتیں ایسی ہیں جن میں مشرق و مغرب کے خیالات میں ابھی تک بہت کچھ تضاد ہے منجملہ اُن باتوں کے ایک یہ ہے کہ مرد و عورت کے باہمی حقوق و ذمہ داریوں کی نوعیت کیا ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جن لڑکیوں کی پرورش یورپ کے تمدن و آب و ہوا میں ہوی ہے۔ ان کا عقد جب کبھی ہندوستانی لڑکیوں سے ہوا تو نوے فیصدی ایسے ازدواج کامیاب ثابت نہیں ہوے۔ مصطفی کمال پاشا اپنی ہی قوم کی ایک ایسی لڑکی سے زیادہ دن نہیں نباہ سکے جس کو متمول والدین نے پیرس کے بہترین مدرسہ نسواں میں تعلیم دلائی تھی۔ عورتوں کی تعلیم کی نوعیت کے اثرات بہت دور تک پہونچنے والے ہیں اس کا اثر ہمارے تمدن کی جڑ تک پہونچے گا۔ اس کا اثر ہماری تہذیب اور ان خیالات پر پڑے گا جن کا تعلق مرد و عورت کے باہمی حقوق و ذمہ داریوں سے ہے یہ کہنا دشوار ہے کہ ہر معاملہ میں یورپ کا تمدن مکمل ہو چکا جس کی پیروی ہم کو کرنا چاہیے جنگ عظیم کے موقع پر یورپ کی تہذیب کسوٹی پر کسی گئی اور ناقص پائی گئی لہذا یورپ کی ہر طرز و ادا اپنی لڑکیوں کے لئے اختیار کر لینا مناسب نہیں ہوگا خود یورپ اس پر غور کر رہا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم مخصوص ان مضامین میں ہونی چاہئے جن کا تعلق اُنکی خاص ضروریات سے ہے لڑکیوں کی تعلیم کی نوعیت قرار دینے میں اگر احتیاط کا پلہ کسی قدر وزنی رہے تو مضائقہ نہیں۔ اس معاملہ میں اگر ہمارے قدم بہت آگے بڑھ گئے تو پھر پلٹنے میں دشواری ہوگی ابھی تو ہم صرف دروازے تک پہونچے ہیں۔

تعلیم نسواں کس نوعیت کی ہونا چاہیئے؟

بہت کم لوگ ایسے باقی رہ گئے ہیں جو اصولاً تعلیم نسواں کے خلاف ہوں۔ سوال اسی قدر ہے کہ اس تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ انسان کی سوسائٹی قدرتاً تبدیل پذیر واقع ہوی ہے اور درسگاہوں میں خواہ لڑکوں کی ہوں یا لڑکیوں کی اسی تبدیلی سے تطابق پیدا کرتے رہنا انسانی ترقی کی روح وجان ہے مثلاً جب ہم نے اس کا تصفیہ کر لیا کہ لڑکیوں کو عام طور سے تعلیم دلانا ضروریات زمانہ کا تقاضا ہے تو پھر انھیں ضروریات کے مد نظر لڑکیوں کے واسطے بھی عام مدارس قائم کرنا ضروری ہو گیا اور اس کی کوشش گورنمنٹ و برادران وطن کر رہے ہیں لیکن جو سوال میرے پیش نظر ہے وہ یہ ہی کہ ان اسکولوں میں کس نوعیت کی تعلیم دی جائے اس وقت جو معیار لڑکیوں کی تعلیم کا قائم کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو لڑکوں کی تعلیم کا ہے یعنے صرف لکھنا پڑھنا سکھا دینا۔ میری رائے میں ہمیں اس مسئلہ کو بھی اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری لڑکیوں کی ضروریات کیا کیا ہیں۔ لڑکی کے خیال وتصور کو "ہوم" یا خانہ داری کے خیال وتصور سے علیحدہ کرنا دشوار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ زندگی کسی قدر آرام سے بسر ہو۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہماری یہ آرزو ہی کہ ہماری لڑکیوں کی تربیت اس طریقہ سے ہو کہ امور خانہ داری کے تمام معاملات میں اُن کو کمال حاصل ہو جائے۔ ہم ان کو گھر کا مالک بنانا چاہتے ہیں جہاں انکی حکومت میں کوئی سہیم وشریک نہ ہو لیکن یہ بات اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہی جبکہ اُن کو ایسے مضامین میں مخصوص تعلیم دی جاوے جنکی

تعلیم لڑکوں کو دلانا غیر ضروری ہی۔ اس وقت حالت یہ ہی کہ لڑکی اور لڑکوں
کے امتحانوں کے نصاب ومضامین قریب قریب یکساں ہیں۔ اس کا نتیجہ
یہ ہے کہ ایک ہی گھر میں دو افراد ایسے جمع ہو جاتے ہیں جو کہ گھر کے مجموعی کام
میں شریک ہو کر کوئی اضافہ نہیں کرسکتے۔ دونوں باورچی خانہ اور کھانے کے
کمرہ کے متعلق وقت کا صرف کرنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں دونوں کو سینے کی
کل چلانے یا بچوں کی پوشاک بنانے کی پروا نہیں۔ دونوں یہ خیال کرنے لگتے
ہیں کہ خانہ داری کرنا یا کھانا پکانا یا کپڑے دھونا یا حساب لکھنا تضیع اوقات ہی
نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم کار نہیں ہوتا۔ خرچ میں بچت نہیں ہوتی۔ ہم آرام سے نہیں
رہ سکتے۔ مکان کی حکومت نوکروں کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ پھر چھوٹے
چھوٹے تکلیف دہ اختلافات نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر لڑکی کے
دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی گزر جاتا ہے کہ کہیں زچگی ان مشاغل میں مخل تو نہ ہو
جن سے اس کی تعلیم نے اس کو وابستہ کر دیا ہے؟ پھر ان خیالات کے قدرتی
نتائج پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہی کہ ابھی تک جس نوعیت کی تعلیم
ہم نے عام طور سے لڑکیوں کے لئے مہیا کی ہے وہ صحیح اصول پر مبنی نہیں ہے
یہ اصول نظر ثانی کا محتاج ہے۔ لڑکیوں کا طریقہ تعلیم بدلنے کے قابل ہی
لڑکیوں کے موجودہ نصاب میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو کہ ترتیب کے لحاظ سے
نیچے پڑے ہوے ہیں اُن کو اوپر لانا چاہئے۔ لڑکیوں کے نصاب میں نرسنگ
یا فن تیمارداری و پرورش اطفال کا نمبر اول ہونا چاہئے۔ ابتدائی جماعتوں
میں لڑکی کی ترقی صرف ان نمبروں پر منحصر نہ رہنا چاہئے جو کہ اُس نے انگریزی

گرامر یا جبرو مقابلہ یا حساب میں حاصل کئے ہوں بلکہ اس پر زیادہ منحصر ہونا چاہیئے
کہ اس نے فن امور خانہ داری و حفظان صحت و تیاری لباس وغیرہ میں کس قدر
مارکس یا نشان حاصل کئے ہیں۔ فوقانیہ مدارس میں لڑکیوں کے مذاق آرائش
میں ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے اور وہ ہنر سکھانا چاہیئے جسکا تعلق انسانی
جذبات اور فنون لطیفہ سے ہے۔ مثلاً نقاشی۔ مصوری۔ زردوزی وغیرہ
اگر لڑکی کو یونیورسٹی کی تعلیم دلانا منظور ہے تو فائن آرٹس یعنے فنون لطیفہ
کے سکھانے کا انتظام کرنا چاہیئے جو خیال میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں وہ صرف
اسی قدر ہے کہ لڑکی کی ابتدائی تعلیم و فوقانیہ تعلیم و یونیورسٹی و جامعہ تعلیم کے
مضامین لڑکے کی تعلیم کے مضامین سے جداگانہ ہونی چاہئیں۔ اگر ہمارا سرمایہ
اس کی اجازت نہیں دیتا تو یہ ممکن ہے کہ ہمارے لڑکیوں کے مدارس کم ہی
رہیں لیکن جو قائم ہوں وہ ایسے اصول پر چلے جائیں کہ اُن میں اور ہمارے
تمدن کے بہترین و اشرف ترین صفات میں تطابق قائم رہے۔ عورت اور
مرد کے باہمی فرائض و حقوق کے متعلق چند خیالات پشتہا پشت سے ہمارے
دماغوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں جو کہ بطور میراث ہم کو پہنچے ہیں اور جو کہ ایک
حد تک مشرق و مغرب میں مابہ الامتیاز ہیں۔ ابھی پوری طرح سے یہ ثابت نہیں
ہوا ہے کہ اس ملک کے حالات کے لحاظ سے وہ خیالات غلط ہیں کسی ایسی
تعلیم کا اختیار کرنا جس کی وجہ سے لڑکیوں کے خیالات میں اور ہمارے
خیالات میں ایک دم سے تصادم پیدا ہو قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا
اگر اہل مغرب کا خیال یہ ہے کہ اہل مشرق عورت کی کافی عزت نہیں کرتے تو

ہم یہ کہیں گے کہ وہ ہماری طبیعتوں کو نہیں سمجھے۔ بھلا مشرق کو اس کی جراُت
کیونکر ہو سکتی ہے کہ اس ماں کو نظر حقارت سے دیکھے جس کی بابت بچپن سے
لڑکوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ بہشت جس کا وعدہ کیا گیا
ہی در اصل ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اور جس ماں کا درجہ خدا و رسول کے
بعد ہی قائم کر دیا گیا ہی ماں اور بہن کی ناموس کا جو خیال مشرق کو ہی اس سے
زیادہ شاید مغرب کو نہیں ہے۔ البتہ ایشیائی خیال کے لحاظ سے بچوں کی پرورش
کرنا عورتوں کا اعلیٰ ترین و مقدس ترین فرض قرار دیا گیا ہے انھیں کے
گہوارہ میں وہ روحیں پلتی ہیں جنکے ہاتھوں میں عصائے شاہی ہوا کرتا ہے
انسانوں کی اس طرح سے خدمت کرنے کا حق خدائے تعالیٰ نے انکی جنس سے
مخصوص کر دیا ہی ہم چاہتے ہیں کہ جب ان کا نصاب تعلیم مقرر کرنے کے لئے
ہم بیٹھیں تو ان کے ان اہم فرایض کو نہ بھولیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری
لڑکیوں کی درس گاہیں اس طرح سے ترتیب دی جائیں اور انکی ایسی تنظیم
ہو کہ شوہری تعلقات کی بابتہ وہ نفیس و نازک خیالات و جذبات جن کے
اثرات سے ایک عورت اپنے شوہر کی نعش کے سامنے جلتی ہوی آگ میں نہایت
خوشی سے کود پڑتی تھی نیست و نابود نہ ہونے پاویں۔ میری یہ غرض نہیں ہی
کہ ستی کے اصول کو صحیح مانا جائے میری غرض صرف اسی قدر بتانا ہے کہ
زن و شوہر کے تعلقات کی نوعیت کی بابتہ ہمارے آبا و اجداد نے خیالات کا
کیسا جوہر کہ چھوڑا ہے۔ لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں اس پہلو کو پیش نظر رکھنے
سے مجھ کو بہت فوایدہ نظر آ رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میں ایسی سوسائٹی کا

قائل نہیں جو ترقی پذیر و تبدیلی پذیر نہ ہو۔ لیکن اس کا بھی قائل نہیں کہ ہمارے
جن آبا و اجداد نے ہزارہا برس سے ایشیاء کا تمدن قائم کیا تھا انھوں نے
ہر معاملہ میں غلطی کی تھی۔ ابھی تک روڈیرڈ کپلنگ کی مثل کہ مشرق مشرق
ہی ہے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ پس ہماری لڑکیوں کی درسگاہوں میں
تعلیم کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں بہ مقابلہ مغربیت کے شرقیت
کی بُو زیادہ پائی جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ انگریزی زبان سے بالکل
بے بہرہ رکھے جائیں میں صرف یہ کہتا ہوں کہ انکی تعلیم و تربیت مشرقی
پہلو کو ہاتھ میں لئے ہوئے رہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق سب سے پہلی
تبدیلی ہمارے اس خیال میں ہونا چاہئے کہ لڑکیوں کو کس امتحان کے
اسناد کی ضرورت ہے۔ میں امید کرتا ہوں کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ چند
ہندوستانی لڑکیوں کے نام کے ساتھ ایم اے یا ایل ایل بی کے حروف دیکھ کر
میں بھی خوش ہو جاؤں مگر ایسی مثالوں کا شمار مستثنیات سے ہونا چاہئے
ان کا ظہور اگر خاص خاص صورتوں و حالات میں ہوتا رہے تو چنداں
مضائقہ نہیں۔ میں اس عام موجودہ تعلیمی ڈھانچہ پر معترض ہوں جس کا
مقصد صرف اسی قدر معلوم ہو رہا ہے کہ لڑکوں کی طرح سے وہ ڈگریاں
حاصل کریں۔ مجھ کو اس میں ذرا بھی عذر نہ ہوگا اگر لڑکیوں کے واسطے وہ تمام
امتحانات موقوف کر دئے جائیں جنکی اصل غرض ڈگری یا سند حاصل کرنی ہوتی
ہی۔ لڑکیوں کے معاملہ میں امتحان کا جو موجودہ طریقہ رائج ہے اُس کے
اختیار کرنے سے اس کے تمام نقصانات تو مترتب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ

معاوضہ کرنے والے فوائد جو لڑکوں کو امتحانات سے بصورت پروانہ
ملازمت وغیرہ مل جاتے ہیں لڑکیوں کو نہیں حاصل ہوتے۔ کیونکہ ہماری
سوسائٹی کا موجودہ تنظیم و بی بی کے خاص فرائض کے متعلق ہمارا تصور
ان کو ملازمت کی اجازت نہیں دیتے۔ امتحان کا موجودہ طریقہ انکی تندرستیوں
میں گھن لگاتا ہے انکی پشت کو خمیدہ بنا دیتا ہے۔ انکی ناکوں پر عینک
لگوا دیتا ہے انکے چہروں کو زرد بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کا فائدہ کچھ نہ ملا۔ ۱۹۰۴ء
میں گورنمنٹ آف انڈیا نے اس ملک کی گزشتہ تاریخ تعلیم پر تبصرہ کرتے
ہوئے چند عام اصول اپنے مشہور رزولیوشن وگشتی میں قائم کئے تھے اور
میرا خیال جاتا ہے کہ اس میں رائج الوقت میٹریکیولیشن امتحان کو ناقص
قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی تھی کہ اس امتحان کی کامیابی سے
اصلی لیاقت کا پتہ نہیں چلتا اور لڑکے کی طبیعت شب و روز امتحان پر
جمی رہتی ہے لہذا یہ بتلایا گیا تھا کہ اگر اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ امتحان کا
طریقہ قائم کر دیا جائے تو لڑکے کی دماغی قوتیں عام ترقی کے لئے آزاد ہو جائینگی
اور ان کو رات دن امتحان کے خوف میں نہ الجھائے رہیں گی۔ جب یہ جدید
امتحان قائم ہو گیا تو اس کے کئی سال کے بعد میں نے ایک مرتبہ ممالک متحدہ
کی مجلس وضع قوانین میں اپنے اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ آیا اسکول لیونگ
سرٹیفکیٹ امتحان جاری کرنے سے وہ غرض حاصل ہوی جس کے لئے دراصل
وہ قائم کیا گیا تھا۔ آج مجھ کو پہلے سے بھی زیادہ شبہ ہے۔ بہر کیف مطلب اپنی قدر
ہی کہ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بھی اس خیال [illegible] متفق تھی کہ رائج الوقت

امتحانوں کے اثرات خراب ہیں اور وہ بہت کچھ اصلاح طلب ہیں۔ اب اسی
طریقہ امتحان کو جو لڑکوں کی حد تک ناقص قرار پا چکا تھا لڑکیوں کی معیار
قابلیت ٹھہرانا انکی نازک جسموں کے حق میں بے رحمی کرنا ہے۔ تین برس
گزرے کہ ایک صاحب امریکہ کے ماہر فن تعلیم حیدرآباد تشریف لائے تھے
انھوں نے اپنے ملک کے ماہران فن تعلیم کے اُن خیالات کا بہت دلچسپ
خاکہ کھینچا تھا جو امتحان کے متعلق رفتہ رفتہ پیدا ہوتے جارہے ہیں وہ یہ
ہیں کہ اسناد وڈگری انسان کی اصلی قابلیت کا معیار نہیں بن سکتے۔ بسا اوقات
اُن سے دھوکہ ہوجاتا ہے۔ بہت سے گرائجویٹ ایسے پائے گئے جو بحیثیت
انسان کے ذلیل تھے اور ان میں کیرکٹر نہ تھا اور بہت سے لوگ ایسے دیکھے
گئے جنھوں نے امتحان کی ڈگری یا سند تو نہیں حاصل کی مگر بحیثیت انسان کے
وہ سند یافتہ اشخاص کے مقابلہ میں اشرف تر و قابل تر تھے یہی وجہ ہی کہ
امریکہ کے جامعہ و یونیورسٹیز اس مسئلہ پر غور و تعمق کی نگاہ سے دیکھ رہی
ہیں اور اس رائے کی جانب ان کا میلان طبیعت ہے کہ سند دینے کا طریقہ بند
کردیا جائے اور اس کی جگہ ایک سرٹیفکٹ یا صداقت نامہ دینے کا طریقہ
اختیار کیا جائے جس میں کالج کے پروفیسر صرف یہ بات تبلادیں کہ طالب علم
درس یونیورسٹی کے کن کن مضامین میں کتنے میقات تک شریک رہا ہے۔
ان کا خیال یہ ہی کہ یونیورسٹی کا اصل کام طلباء کو اعلیٰ و اشرف انسان بنانا
ہی اور یہ کام نہیں ہے کہ ملازمت کے لئے پروانے جاری کرے۔ اگر کسی
شخص کو یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ شخص کی خدمات کی ضرورت ہے تو اسکو

چاہئے کہ اپنے ملازم کی قابلیت واستعداد کا تصفیہ یہ معلوم کرکے کہ اُس نے
کس یونیورسٹی میں کب تک تعلیم پائی ہے خود کرلیوے اور اس کی کوشش
تو ہر یونیورسٹی خود ہی کرے گی کہ عوام میں اس کی عزت و وقار قائم رہے اگر
اس امتحان کے متعلق جو نوکری میں داخل ہونے کا پروانہ دینے کی غرض سے
لیا جاتا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین فن تعلیم کا یہ رجحان ہے تو پھر
یہ امر بہت کچھ غور طلب ہو جاتا ہے کہ لڑکیوں کے واسطے زیادہ فائدہ ایسے
امتحان کے قائم رکھنے میں ہے یا اس کے بند کردینے میں قصہ کوتاہ میں لڑکیوں
کے موجودہ طریقہ تعلیم کو کئی وجوہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ
لڑکیاں اسناد حاصل کرنے کیلئے پڑھائی جائیں مجھے وہ نصاب تعلیم ناپسند
ہی جس کا مقصد صرف علمی تعلیم دینا ہے اور جس میں اقتصادی پہلو بالکل
نظرانداز کردیا گیا ہے مجھے طریقہ تعلیم بھی ناپسند ہے کیونکہ اس سے انکی
صحت خراب ہو جاتی ہے۔ مجھے موجودہ امتحان کا طرز بھی ناپسند ہے
اگر میرے یہ خیالات مقبول ہوں تو لڑکیوں کے بہت سے مدارس کی تنظیم
از سر نو کرنی پڑے گی خواہ وہ مدارس علیگڈھ میں واقع ہوں یا لکھنو میں
ہوں یا حیدرآباد میں ہوں۔ مرد و عورت دونوں خوشی سے زندگی بسر
کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ التجا ہے کہ اسی لحاظ سے ان کو تعلیم بھی دیدی
جائے۔ ابتدائی خطبہ میں جو تین خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ ان میں سے
پہلے کی صراحت میں نے تحت عنوان دیہی تعلیم و شہری تعلیم و تعلیم
نسوان کردی ہے اب دوسرے خیال کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

دوسرا خیال

دوسرے خیال سے میری کیا مراد ہے

میں نے اپنے خطبہ کے ابتدا ہی میں بیان کر دیا تھا کہ تعلیمی پالیسی یا اصول قائم کرتے وقت دوسرا غالب خیال یہ ہونا چاہئے کہ تعلیم ایسی ہو کہ ہماری آیندہ نسلیں ہم سے بہتر ہوں۔ موجودہ طریقہ تعلیم کے پیدا کئے ہوے نمونوں میں مجھ کو تین بڑے بڑے نقائص دکھائی دیتے ہیں اول یہ کہ ان میں قوت تخیل یا غور کرنے کی قوت ذہنی نئی بات پیدا کرنے کا یا اختراع کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ جسمانی حیثیت سے ان میں زوال پیدا ہوتا جارہا ہے تیسرے یہ کہ ان میں باقاعدگی پابندی اوقات اور مستعدی سے کام کرنے کی ان عادات میں کمی ہے۔ جن سے ایک شخص نہ صرف کامیاب کاروباری انسان بن جاتا ہے بلکہ جن کا اثر انسانی کیرکٹر و فطرت پر بھی پڑتا ہے یہ کانفرنس مذہبی نہیں ہے اور اسی لئے میں مذہبی مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا ذاتی تجربہ علیحدہ علیحدہ ہوا کرتا ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ کم از کم مسلمان طبقہ میں ان دماغوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے جنھوں نے اردو ادب میں خواہ نثر ہو یا نظم کسی زمانہ میں عظیم الشان تغیر پیدا کر کے دکھا دیا تھا۔ جنھوں نے علیگڈھ کا دارالعلوم قائم کیا اور جو پوری قوم کو اپنی مٹھی میں رکھ سکتے تھے۔ مجھے ایسے آدمیوں کی کمی معلوم ہو رہی ہے۔ جو کہ بڑی بڑی فوجوں کی سپہ سالاری کر سکیں یا بڑے بڑے شہر آباد کر سکیں میں پرانے طریقہ تعلیم کی حمایت نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ بتا رہا ہوں کہ موجودہ

طریقہ تعلیم میں کچھ نقائص ہیں جنکی وجہ سے ایسے اشخاص و نفوس و کیرکٹرس
کے تیار کرنے میں کافی مدد نہیں ملتی۔ جنکے حالات گزشتہ اسلامی تاریخوں
میں پڑھے جاتے ہیں۔ جہاں تک جسمانی انحطاط کا تعلق ہے میں بحیثیت
ایک ایسے شخص کے کہہ رہا ہوں جو موجودہ طریقہ تعلیم سے خود متاثر
ہو چکا ہے۔ میں بہ حیثیت ان لڑکوں کے باپ کے کہہ رہا ہوں جن کو
میں نے متاثر ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں بہ حیثیت اُس
شخص کے کہہ رہا ہوں جو اپنے ہم وطن اشخاص کے بچوں کو رات دن دیکھا
کرتا ہے۔ ذاتی حیثیت سے یہ کہتا ہوں کہ اس طریقہ تعلیم نے میرے دماغ
پر غیر ضروری بار ڈالا تھا۔ مجھ میں دماغی قوت زیادہ ہونی چاہئے تھی میں
نے اپنے بچوں کو دیکھا ہے کہ ان کو کیا نقصانات پہونچے۔ ہم وطنوں کے
بچوں کو تقسیم انعامات کے جلسوں میں جب کبھی میں مدعو ہوا۔ میں نے اکثر
اس امر کو محسوس کیا کہ انعام پانے والوں نے اپنی تندرستی و ترقی کی آئندہ
امیدوں کو کس قدر خطرے میں ڈال کر وہ انعام حاصل کئے ہیں۔ ان کو
دیکھ کر اکثر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ گو انعام تو انھوں نے حاصل
کر لیا۔ مگر زندگی کے اُن اہم اور اصلی فرائض کی انجام دہی کی قابلیت
جنکے واسطے ان کو تعلیم دی گئی تھی کم ہو گئی۔ ہر شخص جس کی عمر پچاس سال
یا اس سے زاید کی ہے پرانی نسلوں کی تندرستی کا مقابلہ موجودہ نسلوں
کی تندرستی سے کر سکتا ہے۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جسمانی حیثیت سے
ہم میں بہت کچھ انحطاط ہو گیا ہے۔ کیرکٹر داوصاف پیدا کرنے اور اُن

قابل قدر عادات حاصل کرنے میں جو کہ انسان کا اصلی زیور ہیں۔ موجودہ طریقہ
تعلیم نے ایسی مدد نہیں دی جس کی ہم امید کرتے تھے میرا خیال یہ ہے کہ
غلط ذریعہ تفہیم۔ قومی کھیل اور ورزشوں کا زوال۔ فن سپہ گری کا فقدان
گرو چیلے۔ استاد شاگرد میں اجنبیت متذکرہ بالا نقائص کے بہت کچھ
ذمہ دار ہیں۔ اب میں اس دوسرے خیال کے متعلق تین مسائل غور طلب
کے تحت میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ اول مسئلہ ذریعہ تفہیم و تعلیم
دوم مسئلہ تربیت جسمانی۔ سوم مسئلہ دار الاقامہ۔

(۴) مسئلہ زبان تعلیم و تفہیم

امور متعلق مسئلہ زبان تعلیم

زبان تعلیم کا مسئلہ اپنی صد سالہ عمر کو پہنچ چکا ہے۔ یہ
مسئلہ ابتداءً سنہ ۱۸۲۵ء میں اٹھایا گیا تھا اور آج سنہ ۱۹۲۵ء ہے۔ قبل اس کے
کہ میں اپنی زبان اس مسئلہ پر کھولوں میں اس موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی
کی پالیسی کے دور اندیش مدبران کو اس امر کی دلی مبارکباد دیتا ہوں
کہ انھوں نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں ابتدا کی اور وہ ہی
تمام ملک کے رہنما بنے یہ مسئلہ ایسا ہے جس میں تمام ہندوستان کو دلچسپی
ہے یہ وہ مسئلہ ہے جس کے حل کرنے میں ہندوستان کے بہترین ماہرین فن
تعلیم مصروف ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات میرے ساتھ
اس قدر عنایت فرمائیں گے کہ مجھے ان واقعات کے اعادہ کرنے
کی اجازت دیں گے جو کہ غالباً آپ کو تو بہت اچھی طرح سے معلوم ہیں

لیکن ان لوگونکو شاید بخوبی نہ معلوم ہوں جوکہ ہمارے تجربوں سے شاید سبق لینا چاہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی چہار دیواری میں جس کی بنیاد اعلیحضرت بندگانعالی حضور نظام نے ڈالی ہے ایک بہت بڑا اہم قومی مسئلہ حل کیا جارہا ہے ابھی تک اس میں بے حد کامیابی ہوئی ہے۔ ایسے علوم جیسے کیمیا یا نباتات، طبابت، منطق، قانون، معاشیات، دینیات، فلسفہ، تعمیرات، ریاضی ان کی تعلیم یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین کلاسوں اور جماعتوں میں زبان اردو میں دی جاتی ہے۔ لیکن انگریزی ایک لازمی زبان قرار دی گئی ہے۔ اصحاب بیرون ریاست حیدرآباد کو شاید اس عظیم الشان کام سے پوری واقفیت نہیں ہے جوکہ خاموشی کے ساتھ جامعہ کے دارالترجمہ کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں ہورہا ہے۔ جس میں مضامین مذکور پر مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے ہوکر یونیورسٹی کی ضروریات پوری کی جارہی ہیں۔ سرکار عالی نے ہندوستان کے بہترین علمائے لسانیات کو جو لکھے ایک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوران پر ایک کثیر رقم صرف کیجارہی ہے شعبہ قانون کے ڈین یعنے میر شعبہ قانون کی حیثیت سے مجھ کو کچھ معلومات قانونی تعلیم کے متعلق ہوئے ہیں۔ میں الہ آباد یونیورسٹی کے ایل ایل بی طلبا کا ممتحن اور عثمانیہ یونیورسٹی کے اسی درجہ کے طلباء کا ممتحن رہا ہوں میرا خیال یہ ہے کہ اصول قانون کے سمجھنے میں آخرالذکر طلبا کسی طرح سے اول الذکر طلبا سے کم نہیں ہیں۔ دونوں یونیورسٹیوں میں درجہ ال۔ ال بی کے مضامین قریب یکساں ہیں۔ فرق اسی قدر ہے کہ

ہم اپنا قانون اردو میں پڑھاتے ہیں۔ گزشتہ یل۔یل بی کے فائنل یعنی
آخری امتحان میں ہم نے نوے فیصدی ممتحنین کا انتخاب برٹش انڈیا کے
مختلف صوبہ جات کے ججوں اور سربرآوردہ قانون دانوں کے طبقہ
سے کیا تھا (۲۲) طلباء امتحان میں شریک ہوے۔ سب کے سب اول
درجہ میں کامیاب ہوے۔ یہ ضرور ہے کہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے
کے لئے کم از کم صرف (۵۰) نشان کی ضرورت تھی۔ تاہم نتیجہ خود اپنی زبان
بنکر بول رہا ہے۔ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے مجھے صرف اسی قدر
کہنا ہے کہ اب وہ وقت آگیا جبکہ ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم و تفہیم
کے اصول کو زیادہ وسعت دینا چاہیئے۔ فوقانی اور ہائی اسکول کی تعلیم
میں بہ مقابلہ یونیورسٹی کی تعلیم کے اس کی ضرورت اور زیادہ ہے۔ مجھ کو معلوم
ہے کہ ہمارے صیغہ تعلیم نے ملکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کے اصول کو
اس کے قبل تسلیم کر لیا ہے اور اس کی وسعت دینے میں کوشاں ہے
مسئلہ ذریعہ تعلیم و تفہیم کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان کے
بہترین دماغ اسی میں مصروف ہیں اس ریاست میں بھی میں نے چند افراد
کو اس مسئلہ پر جو کہ اس ریاست کی حد تک طے شدہ معلوم ہوتا ہے۔ شبہ
ظاہر کرتے ہوے پایا ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے
پاوے اور اپنے خیالات کا اظہار کسی قدر شرح و بسط سے کروں۔ اگر میں
اس مسئلہ پر آپ حضرات کا قیمتی وقت لوں تو مجھ کو امید ہے کہ آپ معاف
فرمائیں گے۔ ان تمام حضرات کو جنھوں نے ملک کے تعلیمی مسائل پر غور کیا ہے

معلوم ہے کہ ایک صدی قبل اس مسئلہ کی ابتدا کیونکر ہوی۔ اس مسئلہ پر کہ زبان تفہیم و تعلیم ملکی زبان ہونا چاہئے یا انگریزی ۱۸۲۱ء میں راجہ رام موہن رائے نے اپنی زبان کھولی اور جبکہ ۱۸۳۴ء میں خوب زور وشور سے مباحث و تبادلہ خیالات ہو چکے تب لارڈ میکالے نے جو کہ انگریزی تعلیم کے بڑے حامی تھے گورنر جنرل کی کونسل کے پہلے لا ممبر یعنے رکن شعبہ قانون کی حیثیت سے اپنے درجہ اور پایہ کا تمام وزن انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جانب ڈال دیا۔ اور بہ حیثیت ایک ماہر فن تعلیم اور بہ حیثیت ایک قابل ادیب کے انھوں نے ۱۸۳۵ء میں وہ یادگار عرضداشت تیار فرمائی جو کہ ہندوستان کی تاریخ تعلیم میں ایک بڑا اہم و نمایاں واقعہ ہے رائے کا پلہ ایک دم پلٹ گیا۔ مارچ ۱۸۳۵ء میں لارڈ بنٹنک نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ جو رقوم اس وقت تک مشرقی تعلیم کے علوم پر صرف کیجاتی تھیں" وہ آیندہ سے ہندوستان میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی علوم و سائینس کے پھیلانے میں صرف کی جائیں"

یہ آخری فقرہ خاص لارڈ بنٹنک کی تحریر کا اقتباس ہے آج اس فیصلہ کی صحت یا غلطی کی بابت کچھ بھی بحث کرنا ایک فعل عبث ہوگا۔ اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک اس دنیا میں بڑے بڑے تغیرات ہوگئے۔ تو سے برس تک اس پالیسی و طریقہ کا امتحان کیا جا چکا۔ اگر اس پالیسی میں یہ غرض مضمر تھی کہ لوگوں کی طبیعتیں کسی نصب العین کے لئے تیار کیجائیں تو وہ مطلب بھی حاصل

ہو چکا۔ اب تو ہمارے لڑکوں کے دماغوں کو ایک ایسے طریقہ تفہیم وتعلیم کیلئے آزاد کر دینا چاہیئے۔ جس کو ان کی طبیعت و مادری طبیعت سے زیادہ مناسبت ہی۔ صورت موجودہ یہ ہے کہ جب ہمارے گراجوئٹ کالجوں سے نکلتے ہیں ان میں کے اکثر تندرستی کھو کر نکلتے ہیں اور پھر بھی ان میں قوت تخیل بہت کم ہوتی ہے اور مادہ جدت واختراع تو ہوتا ہی نہیں۔

تعلیم کا آخر اصلی مفہوم کیا ہے

مختصر الفاظ میں تعلیم کی تعریف اس طرح کیجاسکتی ہی کہ اس کا مقصد انسان بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو چند دماغی قوتیں ایسی دی ہیں جو ہر لڑکے میں جس نے اس دنیا میں قدم رکھا موجود ہیں۔ عمدہ طریقہ تعلیم وہی ہے جن سے ان تمامی دماغی قوتوں میں ساتھ ساتھ مساوی نشو ونما ہو۔ یہ اچھا نہیں کہ ایک قوت دوسری کو خراب کر کے ترقی کرے مثلاً قوت حافظہ میں کسی دوسری ایسی قوت کو جیسی کہ قوت خیالی ہے زائل کر کے کوئی غیر معمولی نشو ونما پیدا کرنا خوبی کی بات نہیں ہے۔ بہترین انسان کا نمونہ وہی شخص کہا سکتا ہے جس میں یہ تمام قوتیں ایک خاص مناسبت و امتزاج کے ساتھ پائی جائیں۔ میں اپنے ذاتی تجربہ سے بیان کر رہا ہوں کہ جب تعلیم غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے دی جاتی ہے تو لڑکوں کے دماغ اور قوتیں اس زبان کے الفاظ اور فقروں کو حفظ کرنے میں اس قدر صرف ہو جاتی ہیں کہ ان کو اس کا موقع نہیں ملتا کہ اپنے دماغ سے خود کسی بات پر غور کریں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں وہ تقلیدی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے برے نتائج ناگپور یونیورسٹی کے چانسلر یعنے امیر جامعہ

اپنی اس فاضلانہ تقریر میں بیان فرمائے جو انھوں نے کانووکیشن یعنی جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر کی تھی۔ صوبہ ناگپور کے گورنر اور یونیورسٹی کے چانسلر نے ہمارے طلباء کی اس کمزوری کو خوب پہچانا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم و تفہیم ہی اس نتیجہ کا بہت کچھ ذمہ دار ہے ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے سنیٹ یعنی جلسہ نقاد کے موقع پر میں نے ایک تجویز پیش کی تھی جس کا منشاء یہ تھا کہ نصاب جامعہ میں ہماری مادری زبان لازمی مضمون قرار دیدی جائے۔ یورپین ارکان کے سامنے جس طریقہ سے میں نے یہ مسئلہ پیش کیا تھا وہ یہ تھا " فرض کیجیے کہ ولایت کے مدارس میں یہ قاعدہ بنا دیا جائے کہ آیندہ سے انگریزی بچوں کو تاریخ جغرافیہ وحساب کی تعلیم یونانی یا لاطینی زبان میں دی جائے گی تو آپ اس قاعدہ کو کہاں تک پسند کریں گے۔ بہ حیثیت انسان ہمارے ہندوستانی بچے انگریزی بچوں سے جدا فطرت نہیں رکھتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبان ذریعہ تفہیم بنائی جائے" ان کا جواب سن کر شاید آپ کو استعجاب ہو۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ ممالک متحدہ صوبہ آگرہ و اودھ میں آپ کی کوئی مادری زبان ہی نہیں ایک صاحب تو ہندی کو اور دوسرے صاحب اردو کو مادری زبان بیان کرتے ہیں۔ اب اس قسم کے مباحثہ میں پڑ جانے سے میں اپنے موجودہ خطبہ کے اصلی مقصد سے بہت دور ہو جاؤنگا۔ برٹش انڈیا میں شعبہ تعلیم منسٹرس و عوام کے نمایندوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں وہاں کے وزیر محکمہ تعلیمات سے اب یہ استدعا کرونگا کہ اب وہ اس مسئلہ کو طے فرمائیں کہ آیا ہماری کوئی مادری زبان ہے یا نہیں ؟ ڈاکٹر پرانج پے اور ایسے ہی

ماہران فن تعلیم کا یہ خیال ہو کہ برٹش انڈیا میں ابھی وہ زمانہ نہیں آیا ہے کہ یونیورسٹیز میں ملکی زبان ذریعہ تفہیم بنائی جائے لیکن وہ بھی اس کے تو قائل ہیں کہ ہائی اسکول یعنے مدارس فوقانیہ میں ملکی زبان کو ذریعہ تفہیم بنانا مناسب وضروری ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انگریزی زبان کروڑوں ہندوستانیوں کی مادری زبان نہیں بن سکتی۔ فوقانیہ مدارس کے دروازوں تک ہمارے کروڑوں ہندوستانیوں کی رسائی اسی وقت ہوسکے گی جبکہ علوم انکی مادری زبان میں پڑھائے جائیں۔ علوم حاصل کرنے کا سب سے سیدھا اور نزدیک ترین راستہ لوگوں کی ملکی ہی زبان ہوا کرتی ہے۔ عوام الناس کی رسائی علوم تک انگریزی زبان کے راستہ سے صدیوں تک بھی نہ ہوسکیگی یہ دوسری بات ہے کہ معدودے چند انگریزی اسکولوں میں ہمیشہ تعلیم پاتے رہیں لہذا اگر عوام کی بہبودی مقصود ہے تو اس کام کی ابتداء ہم ابھی سے کیوں نہ کریں جس کو بالآخر ایک نہ ایک روز کرنا پڑے گا۔ اس مسئلہ کو کسی نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائے۔ ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کفایت شعاری کے نقطہ نظر سے دیکھئے۔ ملکی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں ہمیشہ ارزاں ہونگی وہ والدین جنکو ہر سال ہر جماعت کے واسطے اپنے لڑکوں کے لئے انگریزی جغرافیہ۔ انگریزی تاریخ۔ انگریزی جبر و مقابلہ۔ انگریزی کتابیں خریدنی پڑتی ہیں۔ وہی والدین اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ انگریزی کتابوں کی خریداری میں سالانہ کس قدر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر ملکی زبان کے پڑھانے والے اساتذہ بھی کثیر التعداد مہیا

ہو سکیں گے۔ اگر سکنڈری ثانوی تعلیم کے مصارف میں آپ کمی کر سکیں تو یہ سمجھئے کہ گویا آپ عوام الناس میں اس تعلیم کے پھیلانے کا انتظام کر رہے ہیں بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ و جغرافیہ وغیرہ کی درسی کتابیں ملکی زبان میں ابھی موجود نہیں ہیں۔ اول تو اس قسم کا اعتراض ممکن ہی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے کسی حد تک قابل پذیرائی ہو مگر فوقانیہ تعلیم کے لئے کسی صورت میں قابل پذیرائی نہیں ہے دوم جب تک ہم اپنی ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم و تفہیم قرار نہ دینگے تو اس زبان میں کتابوں کا لکھا جانا ہی دشوار ہے۔ اس کا دار و مدار تو طلب اور رسد کے اصول پر ہے۔ ہائی اسکول کے چھٹے فارم سے لے کر یونیورسٹی کی بالاترین جماعت تک انگریزی ارتھمیٹک۔ انگریزی الجبرا۔ انگریزی تاریخ۔ انگریزی جغرافیہ کی ضرورت ہے لہذا بازار میں انھیں کی مانگ ہے۔ پھر ملکی زبان میں ان مضامین پر کون کتابیں لکھے گا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جب سنہ ۱۸۲۵ء میں اسی مسئلہ پر بحث چھڑی تو دو گروہ قائم ہو گئے۔ ایک وہ جو کہ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا حامی تھا۔ اور ایک وہ جو مشرقی زبانوں کا حامی تھا۔ اول الذکر گروہ کی اصلی حجت یہ تھی کہ جو کتابیں اسکول کے نصاب میں مقرر کی جاتی ہیں وہ ملکی زبانوں میں مہیا نہیں ہیں اس زمانہ کی بابتہ ٹریویلین نے اپنی کتاب تعلیم ہندوستان میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ "انگریزی کتابوں کی مانگ سنہ ۱۸۳۰ء میں اس قدر تھی کہ اکتیس ہزار انگریزی کتابیں انگریزی کتب فروشوں نے دو سال میں

فروخت کیں لیکن تعلیمی کمیٹی تین برس میں بھی عربی وسنسکرت زبان کی کتابوں کو اس تعداد میں بھی فروخت نہ کر سکی کہ صرف انکی دو ماہ کی کتابت کا خرچہ انکی قیمت سے نکل سکتا طبع کرنے کے اخراجات تو درکنار تھے کیا ہمارے لئے یہ امر باعث شرم نہیں ہے کہ اس وقت سے لے کر ایک صدی گزر گئی۔ اور ماگ کے حد تک ہماری مادری زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی حالت میں کوئی زیادہ تغیر نہیں ہوا۔ بلکہ ابتر ہو گئی؟ یہ نتیجہ بہت ہی عبرت انگیز ہے۔ لیکن میں اس نتیجہ کا ذمہ دار طریقہ تعلیم وتفہیم کو قرار دیتا ہوں۔ ملکی زبان کے خلاف جو منطق کہ اختیار کی جاتی ہے اوہ یہ ہے کہ "ملکی زبانیں ذریعہ تعلیم نہیں بنائی جاسکتیں۔ کیونکہ اس زبان میں کتابیں نہیں ہیں" لیکن سو برس کے تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جب تک مدارس میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم رہے گی ملکی زبان میں کتابیں نہ ہونگی لہذا نتیجہ یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے ملکی زبان میں کبھی کتابیں ہی نہ ہونگی۔ یا یوں کہیئے کہ ملکی زبان کبھی ذریعہ تعلیم نہ بنے گی۔ کیا یہ منطق ملکی زبانوں کے حق میں صحیح وواجبی ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر آپ پالیسی بدل دیں اور ملکی زبانیں ذریعہ تعلیم قرار دیدیں تو ایک ہی پشت میں کتب فروشوں کی الماریاں ان مضامین پر ملکی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں سے بھر جائنگی جو نصاب میں مقرر کی جائیں۔ اب اس مسئلہ پر قوت متخیلہ کے نقطۂ نظر سے دیکھیئے۔ تصنیف وتالیف کے

میدان میں بہت سے باخبر ہندوستانی دماغ اس وجہ سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں
کہ انگریزی میں جس پر حاوی ہونا ان کے لئے دشوار ہے کوئی معقول کتاب
لکھنے کی ان کو قابلیت نہیں ہے اور اپنی ملکی زبان میں اس لئے لکھنے
کی کوشش نہیں کرتے کہ بازار میں اس کی مانگ نہیں ہے۔ میں نے اپنے
ہم وطنوں کے پاس ملکی زبان میں لکھے ہوئے ایسے قلمی مسودے دیکھے
ہیں کہ اگر وہ انگریزی زبان میں لکھے جاتے تو ان سے ہزاروں روپیہ
کی آمدنی ہوتی۔ لیکن ان مصنفین میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے سرمایہ کو
اس کتاب کے طبع کرانے میں صرف کریں جس کی مانگ انکے ملک میں نہ ہوگی
کیا یہ بات قابل افسوس نہیں ہے؟ ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے
میری یہ مراد نہیں ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم بند کر دی جائے۔ میں
وہ آخری شخص ہونگا جو اس زبان کے پڑھائے جانے کی مخالفت میں
زبان کھولے۔ جس کے پڑھنے سے خود مجھ کو اس قدر فائدہ پہونچ چکا ہے
اور جس کے احسانات کے بار گراں سے ہندوستان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا
کسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے خواہ وہ نقطہ نظر تعلیمی ہو یا سیاسی ہو یا
انتظامی ہو۔ میں یہی خواہش کروں گا کہ زبان انگریزی کا چشمہ سرزمین
ہند پر ہمیشہ بہتا رہے اور کبھی خشک نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اسی
انگریزی زبان کے ذریعہ ہم یورپ کے ان علوم و فنون سے زیادہ آسانی
سے آشنا ہو سکیں گے جن کی ہم میں اس وقت بے حد کمی ہے۔ اسی
انگریزی زبان کی مدد سے ہم اپنے آپ کو اس امپائر سے وابستہ

کریں گے جس میں پہننے کا تصفیہ ہم نے کر لیا ہے اور بالآخر ہماری خواہش یہ ہے کہ اسی زبان کے ذریعہ سے مشرق مغرب سے مصافحہ کرے۔ اگر ایسے ترقی یافتہ ممالک بھی جیسے کہ جاپان۔ جرمنی۔ فرانس و ولایت ہیں اس ضرورت کو خود اپنے ہی فائدہ کی غرض سے محسوس کر رہے ہیں کہ ممالک غیر کی زبانوں کو جاننا اُن کی تعلیمی اسکیم اور ڈھانچے کا ایک جزو ہے تو پھر ہندوستان جو کہ تعلیمی حیثیت سے اس قدر گرا ہوا ہے کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ وہ کھڑکیاں اور روشندان جن سے علم و ہنر کی اس قدر روشنی اُس کے بچوں کے دلوں پر پڑ رہی ہے بند کر دئے جائیں۔ اگر مغربی ترقی یافتہ اقوام غیر ممالک کی زبانوں کا سیکھنا ایک مستقل ضرورت سمجھتے ہیں تو پھر ہمارے لئے سوائے انگریزی کے کون دوسری زبان اس غرض کو پورا کرنے کے لئے زیادہ کار آمد ہو سکتی ہے لہذا میں یہ نہیں چاہتا کہ انگریزی مدارس و کالج بند کر دئے جائیں لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہمارے اسکول اور کالجوں میں انگریزی زبان کی وہی پوزیشن اور درجہ قائم کیا جائے جو کسی تہذیب یافتہ ملک میں غیر ملک کی زبان کا ہوا کرتا ہے۔ وہی درجہ جو انگلستان جرمنی و فرانس و جاپان میں غیر ملکی زبان کا ہے۔ جو بات میں لکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ زبان کے درجوں کی جو ترتیب ہمارے مدارس اور کالجوں میں قائم ہے وہ پلٹ دی جائے۔ جو درجہ کہ اس وقت انگریزی زبان کو حاصل ہے وہ ہماری ملکی زبانوں کو حاصل ہو جائے۔ اور جو درجہ کہ اس

وقت ملکی زبانوں کو نصاب میں حاصل ہے وہ انگریزی زبان کو دیا جائے۔
یا یوں کہئے کہ پہلی زبان جس کا سکھانا لازمی قرار دیا جائے وہ ملکی ہو
اور دوسری لازمی زبان انگریزی ہو۔ مطلب صرف اسی قدر ہے کہ
دنیا کے علوم و فنون ہم کو ہمارے ملکی زبانوں میں سکھائے جائیں کیونکہ
اس طریقہ سے ہماری دماغی و جسمانی قوتوں کا صرف بے جا نہ ہوگا۔
اور بالآخر قومی ترقی میں اس سے مدد ملے گی۔ اس تبدیلی کے بعد بھی
زبان انگریزی نہ صرف ہند کے مختلف صوبہ جات میں تعلق پیدا کرنے
کے لئے لڑی کا کام دیتی رہے گی بلکہ اسی کی مدد سے ہند اور تمام برٹش
امپائر اور تمام انگریزی زبان بولنے والے اقوام سے جیسے کہ امریکہ
وغیرہ خاص تعلق قائم رہے گا لہذا اس میں ہماری ہی غرض شامل ہے
کہ یہ مفید و کارآمد تعلق کی کڑی برقرار رہے۔ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے
کہ ہمارے نصاب تعلیم میں زبانوں کے پوزیشن اور مدارج میں اس
قسم کی تبدیلی کرنے سے گو کہ لڑکوں کے دماغوں سے موجودہ بار کسی
حد تک اٹھ جائے گا لیکن انگریزی زبان کی علمی لیاقت بہت گھٹ
جائیگی۔ میں اس اعتراض کو تسلیم کئے لیتا ہوں۔ لیکن جب ذریعہ
تعلیم و تفہیم کے دو طریقے ہیں تو ہم کو ان دونوں کے فوائد و نقصانات
کا موازنہ کرنا ہے۔ اگر ایک جانب انگریزی الفاظ پر کافی قدرت نہ حاصل
کرنے کا نقصان ہے تو دوسری جانب یہ فائدہ کہ ہم کو ملکی زبانوں کے
الفاظ پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور ہماری طاقت دماغی اور قوت تخیل

میں اضافہ ہوتا ہے۔ اصلی چیز جو انسان کو بناتی ہے وہ خیالات ہیں نہ کہ غیر زبان
کے الفاظ۔ کچھ زمانہ ہوا کہ میں نے فرانس کے ایک بہت بڑے شخص ماسو کیلے
کی لکھی ہوی انگریزی عبارت کا نمونہ ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ انھوں نے
گرامر یعنے قواعد و پنکچویشن یعنے نکتہ گزاری کی صریحی غلطیاں کی تھیں
اور ایک انگریزی اخبار میں ان غلطیوں پر چند طنزیہ فقرہ کسے گئے تھے
اگر میں ہندوستانی طلبہ کے دماغوں میں وہی خیالی قوت پیدا کر سکوں
جو فرانس کے مدبر ماسو کیلے میں پائی جاتی ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں
کہ ہمارے بچے انگریزی مضمون نویسی میں اس سے بھی زیادہ غلطیاں کریں
جو کہ ولایت کے پڑوسی و ہمسایہ فرنچ نے کیں۔ جسکی قابلیت تمام یورپ
میں مسلمہ ہے۔ قومی نقطہ نظر سے اسی قدر کافی ہے۔ اگر ہماری تعلیمی تنظیم
اس کی ضامن ہو جائے کہ عام طور سے ہمارے طلبہ اس قدر زبان انگریزی
سے واقف رہیں گے کہ وہ اس زبان کو سمجھ سکیں اور اپنے خیالات کا اظہار
اس طرح سے کر سکیں کہ دوسرے اشخاص سمجھ لیں۔ لہذا میری تجویز یہ
ہی کہ ہائی اسکول یعنے فوقانیہ مدارس کے نصاب میں ایسی تبدیلی کیجائے
کہ بارہ برس کی عمر تک لڑکے کو ایسے مضامین میں ابتدائی تعلیم جیسے کہ
حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ میں اسی کی ملکی زبان میں دی جا سکے۔ بارہ
برس کی عمر تک انگریزی جیسی غیر زبان سیکھنے کا بار بچے کے دماغ پر نہ
پڑنا چاہئے۔ اس طریقہ سے وقت اور قوت کی بہت کچھ کفایت شعاری
ہوتی ہے۔ نھنے سے دماغ کی قوتیں محدود ہیں اور ہم کو چاہئے کہ اس کا

بہترین استعمال اس طریقہ سے کریں کہ اس قوت کا کوئی جزو ضائع نہ ہونے پاوے۔ اس کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ہمارا بچہ اپنے مذہب سے بھی زیادہ نزدیک ہو جائے گا کیونکہ مذہبی کتابیں اکثر اس کے ملک کی زبان ہی میں ہیں۔ میں ہندوستان کی ہر گورنمنٹ کے روبرو خواہ وہ ہندوستانی ریاست ہو یا نہ ہو ملکی زبانوں کا وکیل اور حامی بنکر بہت عاجزی کے ساتھ یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ بہ طفیل ہمارے چھوٹے چھوٹے بچوں کے بلا تربیت یافتہ دماغوں کے جو کہ اس وقت غیر ملکی زبان کے الفاظ اور فقرات یاد کرتے کرتے دبے جا رہے ہیں۔ میں بہ طفیل اس دماغی اور جسمانی ترقی کے جس کا حاصل کرنا دنیا کی جد و جہد کا مقابلہ کرنے کے لئے اب ہندوستانیوں کو بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں بہ طفیل اس طریقہ تعلیم کے جو سوائے ہندوستان کے تمام مہذب ملکوں میں اس وقت رائج ہے۔ میں بہ طفیل اس تصور کے جو بہترین و اشرف ترین تصور تعلیم کا ہے استدعا کرتا ہوں کہ ہماری یہ درخواست قبول فرمائی جائے کہ ہمارے مدارس اور کالجوں میں ہماری مادری اور ملکی زبان کو یہ عزت و شرف حاصل ہو کہ اس کے ذریعہ سے ہمارے بچوں کو مدارس اور کالجوں میں علوم و فنون سکھائے جائیں۔ مجھ کو یقین کامل ہے کہ اس تبدیلی سے بہتر افراد پیدا ہونگے۔

(۵) مسئلہ جسمانی تربیت

اگر میں جسمانی تربیت کے جزئیات میں داخل ہونا چاہوں تو موجودہ خطبہ

میں غیر ضروری طوالت ہوگی۔ میرا تجربہ مجھ کو یہ بتلاتا ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم سے وہ اوصاف بچوں میں نہیں آتے جو کہ انگریزی لفظ کریکٹر میں یا یوں کہیئے کہ سیرت اور خصلت کے مفہوم میں شامل سمجھے جاتے ہیں لہٰذا مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے لڑکوں کو کچھ ایسی تربیت کی ضرورت ہے کہ ان میں ڈیسپلن یعنے ادب وضبط کا مادہ بڑھ جائے اور ایسی جسمانی و دماغی تربیت ہو کہ اس زندگی میں سیدھے ہو کر خودداری اور جوانمردی کے ساتھ قدم اٹھائیں۔ اس غرض سے میری یہ خواہش ہے کہ ہمارے ہائی اسکول و یونیورسٹی کی تنظیم و تعلیم میں اس نوعیت کی فوجی تعلیم شامل کردی جائے جو کہ سیولینس یعنے غیر فوجی اشخاص کے لئے موزوں ہو۔ اس کا تعلق ان فوجی کالجوں سے نہیں ہے جو کہ ملک کی حفاظت کرنے کی غرض سے قائم کئے گئے ہیں۔ ہر شخص اب اس کو تسلیم کرتا ہے کہ جسمانی تربیت اور ترقی کا اثر انسان کے کریکٹر، خصلت اور سیرت پر بہت کچھ پڑتا ہے۔ مدارس میں قواعد اور ہاکی۔ فٹ بال۔ کرکٹ ورزشی کھیلوں کے ٹورنمنٹ و مقابلہ سے بہت کچھ مقصد حاصل ہوجاتا ہے لیکن میں اس علاج کو ناکافی پاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دوا کی خوراک کی مقدار بڑھا دی جائے تاکہ حسب دلخواہ اطمینان بخش نتائج پیدا ہوں۔ فزیالوجی یعنے علم عضویات و سائکالوجی یعنے علم نفسیات نے اس وقت تک جو کچھ سکھایا ہے اس سے بلا شک وشبہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ دماغی ترقی کو جسمانی ترقی سے علیحدہ کرنا دشوار ہے۔ میری

دانست میں یہ مناسب ہوگا کہ تمام سرکاری مدارس فوقانیہ میں کھیل کے میدان اور فوجی تعلیم دینے والے شخصوں کا انتظام کرنا لازمی کردیا جائے اور کسی خانگی فوقانی اسکول کو قیام کی اجازت اس وقت تک نہ دی جائے جب تک اس میں ان باتوں کا انتظام نہ کیا جائے۔ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ فوقانیہ اسکول میں اسکول لیونگ سرٹیفکٹ امتحان کی کامیابی کی سند اس وقت تک نہ دی جائے جب تک طالب علم جسمانی و فوجی تعلیم میں بھی کامیابی حاصل نہ کرے۔ آخران اسناد کی اصلی قیمت عوام اور سرکار کی نظر میں اسی قدر ہے کہ جس شخص نے اس سند کو حاصل کیا ہے اس کے نسبت یہ قیاس کیا جائے گا کہ وہ اپنے فرائض کو اس حد تک جس کا اظہار ان اسناد سے ہوتا ہے قابلیت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس ایسی سند ہو جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ طالب علم نے مردانہ کھیلوں اور مشاغل میں بزمانہ طالب علمی کہاں تک دلچسپی لی تھی تو اس سرٹیفکٹ سے عوام اور سرکار دونوں کو مختلف فرائض کی انجام دہی کے لئے قابل اشخاص کے انتخاب کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے اس ملازمت کے لئے بھی جس میں عرصہ تک مینر کرسی پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ میں ایسے شخص کو ترجیح دونگا جس کی جسمانی حالت اچھی ہے اور جس کو کچھ فوجی تعلیم ہوئی ہے۔ جنگ عظیم کے موقعہ پر یہ دیکھا گیا کہ جرمن فوج کے سپہ سالار وہ اشخاص تھے جن کا پیشہ اسکول ماسٹری۔ پروفیسری اور تجارت تھا۔ میری غرض

صرف اسی قدر ہی کہ فوجی تعلیم سے چند خصائل ایسے حاصل ہو جاتے ہیں
جن سے ہر شعبہ زندگی میں مدد ملتی ہے۔ گزشتہ صدی نے ہماری فوجی
مذاق و ملٹری اسپرٹ کو بالکل مسل ڈالا اور بے جان کر دیا۔ ہمارے
ہم وطنوں میں ان صفات میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے۔ جن کا تعلق
اس زندگی میں شجاعانہ مشاغل سے ہے اور اسی کا میں کچھ علاج چاہتا
ہوں۔ میں اس ملک کے خاص حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ یہی
وجہ ہے کہ میری اسکیم و تجویز بہت ہی معتدل و واجبی پیرایہ میں
ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ابتدا میں ہم اسی تعلیم کو ان مقامات کے چند
ہائی اسکول اور کالجوں تک محدود کر دیں جہاں بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں
ہیں اور جہاں فوجی تعلیم دینے والے ہفتہ میں چند گھنٹوں کے واسطے
آسانی سے مہیا ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ حیدرآباد میں ہمارے
بادشاہ نے حال ہی میں ایک ملٹری کالج قائم کرنے کی منظوری صادر
فرمائی ہے حیدرآباد کی درسگاہوں اور اس ملٹری کالج میں تو اتحادی
عمل ممکن ہو گا۔ جزئیات میں جانے سے وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے
میں چند اصولی باتوں کا حوالہ دے رہا ہوں۔ میری غرض صرف اسی قدر
ہی کہ اس جانب بھی تھوڑی بہت شروعات کرنی چاہئیے۔ میں خواب
نہیں دیکھ رہا ہوں۔ فوجی تعلیم کے متعلق میرے دماغ میں کوئی خیالی
پلاؤ نہیں پک رہا ہے۔ گزشتہ سال جبکہ کیمبرج کے ایک کالج کے
احاطہ میں پھر رہا تھا اس وقت میری نظر اس کالج کے پھاٹک پر پڑی

جس پر اشتہار کا تختہ نصب تھا اور جس میں مجھ کو کسی قدر دلچسپی معلوم ہوی ایک اشتہار میں یونیورسٹی کور کی فوجی تعلیم کے اوقات معین دکھائی دئے میرا لڑکا اس وقت میرے ساتھ تھا۔ میں نے اُسے دریافت کیا کہ کیا وہ اسمیں شریک ہو سکتا ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ ہندوستانیوں کو اس میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے بڑے اسکولوں اور کالجوں میں بھی اُسی طریقے کا کچھ انتظام کیا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان کے بعض کالجوں میں ایک تحریک اسی قسم کی موجود ہے لیکن ضرورت اسکی ہے کہ اس تحریک کو زیادہ قوت پہونچائی جائے اور اس کے متعلق زیادہ عملی کام ہو۔ اگر ایسی فوجی تعلیم جو کہ سیویلین یعنے غیر فوجی طبقے کے امتحان کے لئے موزوں ہو نصاب میں ایک اختیاری مضمون بنا دیا جائے تو بہتر ہوگا وہ طلبا جو اس اختیاری مضمون کو لیں گے ان کی جانب قدرتاً زیادہ توجہ کی جانے گی۔ لوگوں کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ مجھ کو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر ہماری تعلیم میں فوجی تعلیم شامل کر دی جائے تو موجودہ نسل سے آئندہ نسل بہتر ہوگی۔

(۶) مسئلہ دار الاقامہ

امور متعلق دار الاقامہ

مسلمانوں کے ذہن میں دار الاقامہ کا جو تصور تھا اس کا پتہ قاہرہ و قرطبہ کی یونیورسٹی کے حالات سے چلتا ہے۔ ہندوستان کے قدیم زمانہ میں جب انسان کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک

ایسا حصہ قائم کیا تھا جس کو گرو یا پنڈت کے ساتھ گزارنا پڑتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ہنود میں استاد و شاگرد یا گرو اور چیلے کے ایک ساتھ رہنے کو کہاں تک اہمیت دی گئی تھی۔ مرور زمانہ سے طریقے بدل گئے ہوں مگر قدیم اور نئے طریقوں میں جو خیال مضمر ہے وہ ایک ہی ہے یعنے طریقہ' دارالاقامہ کی اہمیت۔ میرا اعتقاد اُن دارالاقامہ پر ہے جو ٹھیک اصولوں پر قائم کئے جائیں اور جن سے سیرت و خلق و کیرکٹر کے بننے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ ایک معقول شخص کی نگرانی میں بہت سے طلباء کے ایک ساتھ رہنے میں چند فوائد میں جو دوسرے طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کی اسپرٹ و ذوق میں جو موقعے ترقی کے پیدا ہوتے ہیں۔ مردانہ کھیل اور مشاغل کی شرکت میں جو آسانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ مستعدی و پابندی اوقات کی جو عادتیں پڑتی ہیں۔ مخرب زندگی کے خطرات سے جو حفظ و امن ملتا ہے۔ طلباء کا غیر طلباء کے ساتھ رہنے سے جو امور طلباء کی توجہ کو ہٹاتے ہیں۔ اُن سے آزادی کا حاصل ہونا یہ تمام باتیں دارالاقامہ کی زندگی کے فوائد میں سے چند فوائد ہیں لیکن مجھے ایسے دارالاقامہ سے نفرت ہے جہاں اپنے گھر کا آرام تو کچھ نہ ملے اور ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہو جس کا ذکر کیا جا چکا۔ مجھ کو ایسے دارالاقامہ سے نفرت ہے جہاں صرف کمرہ رہنے کو دیدیا جائے لیکن لڑکے کو اپنے باورچی دھوبی اور ملازم کا انتظام خود کرنا پڑے ان افکار میں اس کا وقت تو

صرف ہو جاتا ہے لیکن فائدہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ تمام ہندوستان میں ایسے دارالاقامہ جنکی اصلی ضرورت ملک کو ہی بہت کم ہیں۔ مدراس بمبئی کلکتہ ایسے مقامات پر بھی طلباء کو اصل دارالاقامہ کی زندگی کے فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے دارالاقامہ پر کسی حدتک اصلی دارالاقامہ کی تعریف صادق آسکتی ہے لیکن وہ بھی مکمل نہیں۔ غالباً بہترین دارالاقامہ جو بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں وہ کیمبرج و اکسفورڈ کالج کے ہیں۔ اور ایٹن وہیر و اسکول کے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ بجائے ان اسکولوں اور کالجوں کے جہاں کیرکٹر یا اچھی خصائل حاصل کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس وقت دارالاقاموں کی زیادہ ضرورت ہے۔ دارالاقامہ کا مسئلہ قومی تعلیم کے مسئلہ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کے حل کرنے کی کوشش اس طرح سے کرنا چاہئے جیسا کہ اس کی اہمیت کا تقاضہ ہے بالآخر میں یہ عرض کرونگا کہ اگر ہماری ملکی زبانیں ذریعۂ تعلیم بنا دی جائیں۔ جسمانی تربیت اور دارالاقامہ کا انتظام معقول کیا جاے تو ہماری آئندہ نسلیں موجودہ نسلوں سے دماغی اور جسمانی دونوں حالتوں میں بہتر ہوں گی۔

تیسرا خیال

(۷) ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی تعلیم کا مسئلہ

تیسرا خیال جس کا غلبہ	وہ مسائل جن کا تعلق ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے سے ہے

نوعیت تعلیم کے قرار دینے میں اور اسی کی پالیسی پر ہونا چاہئے وہ یہ کہ تعلیم ایسی ہو جو ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی موئد ہو وہ برادران وطن جن کی نظر حال کے ان واقعات پر رہی ہے جنھوں نے ہمارے ملک کے پاک صاف چہرہ پر ایک بدنما دھبہ لگایا ہے فوراً سمجھ جائنگے کہ اس خیال سے میری کیا مراد ہے۔ یہ انھیں دو فرقوں کی اتحاد کا مسئلہ ہے جنکی بابت سر سید مرحوم نے فرمایا تھا کہ ان کا باہمی تعلق ایسا ہے جیسا کہ ایک ہی چہرہ کی دونوں آنکھوں کا آپس میں ہوا کرتا ہے۔ ہندوستان کے ان دو بڑے فرقوں کو متحد کرنے میں مہاتما گاندھی نے جان توڑ کوشش کی لیکن مظالم دمشق کے سلسلہ میں جب ان سے تار بھیجنے کو کہا گیا تو ان کے اس جواب سے کہ ان کی حالت ایک ایسے شیر کی ہی جو کہ ایک کٹرہ میں مقید ہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے زرہ اور ہتیار اتار ڈالے۔ میرے دوست پنڈت موتی لال نہرو بھی کسی قدر مایوس معلوم ہو رہے ہیں۔ میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ یہ حضرات جس اتحاد کو کہیں نہ پاسکے اُس کے ڈھونڈھنے کے واسطے ذرا تعلیم کے دروازے پر تو دستک دیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اتحاد کی عمارت صحیح طریقہ تعلیم کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ پارسال میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جس کا نام "ہند عہد اورنگزیب میں اور ہندو مسلم اتحاد پر ایک نظر" ہے جس کے باب دوم میں مسئلہ اتحاد ہندو مسلم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے اس بات کے دکھلانے کی کوشش کی تھی کہ صحیح تعلیم کے وہ کونسے طریقے ہیں جن سے یہ مقصد

حاصل ہو سکتا ہے میری یہ تجویز تھی کہ ہندوستان کی تاریخیں نوجوان اثر پذیر عمر کے بچوں کے نصاب تعلیم میں مقرر کئے جانے کے لئے جدید طریقے اور ہمارے نقطہ نظر سے لکھی جائیں اُن کا مطمح نظر بلند ہو اُس کا بہت کچھ مواد مورخ کو مل سکتا ہے کہ سرزمین ہند پر جو مختلف اقوام کی لہریں آئیں اور اپنی اپنی تہذیب کے اثرات چھوڑ گئی ہیں ان سب سے اس ملک کے ارتقاء میں بہت کچھ مدد ملی ہے۔ اگر صحیح نقطہ نظر سے ہندوستان کی تاریخ مرتب کیجائے اور بچوں کو پڑھائی جائے تو اتحاد کی بہت اچھی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو تاریخیں ہمارے بچوں کو انکی اثر پذیر کم عمری میں پڑھائی گئیں انھوں نے مسلمانوں کے زمانہ حکومت کو متعصبانہ نظر سے دیکھا اور ان بچوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور تعصب کے وہ بیج بو دئے گئے جن کے ثمرات کے مزے ہم کو چکھنا پڑے ہیں۔ ہمارے نصاب سے ایسی تاریخیں نکال ڈالی جائیں۔ میں اس پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہماری درسگاہوں میں ہندو مسلمانوں کے باہمی ملنے کے مواقع بڑھانا چاہیے قومی اسکول اور مدارس اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں کہ غیر اقوام کے طلبا اپنی درس گاہوں میں ایک خاص مناسبت کے ساتھ داخل کرتے رہیں۔ ایک ہی جماعت میں ملنے جلنے سے ایک ہی ہوا میں رہنے سے ایک ہی تپائیوں پر بیٹھنے سے ایک ہی میدان میں کھیلنے سے ایک ہی پروفیسر کے جذبات سے مستفید ہونے سے ہندو مسلمان بچوں کی باہمی دوستی ایک ایسی مضبوط بندش سے جکڑ جائے گی جو کہ ان بڑے بڑے سیاسی جذبات

کے اثر اور دباؤ سے بھی نہ ٹوٹے گی جن کا سماں آج کل نہ صرف ریاستوں
اور برٹش انڈیا میں بلکہ تمام دنیا میں دکھلائی دے رہا ہے۔ ان دونوں قوموں
میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ہم کو اپنے پروفیسر اور اساتذہ کے انتخاب میں بڑی
ہوشیاری سے کام لینا چاہیئے وہی کاریگر ہیں اور آلہ تعمیر ان ہی کے ہاتھ میں
ہوا کرتا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے طرز عمل و کیرکٹر کے اثر سے ہندو مسلمان
لڑکوں کو شیر و شکر بنا سکتے ہیں یا اس موجودہ فصل کو جو کہ آج دکھائی دے
رہا ہے اور بھی زیادہ عمیق کر سکتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ اور پروفیسروں کو
سیاسیات سے بالاتر ہونا چاہیئے وہ مثل ایک ایسے بادشاہ کے ہیں جو علم اور
فضیلت کی بلند چوٹیوں پر بیٹھ کر اپنے علوم کی روشنی اور چھاپ ہر متنفس
پر بلالحاظ اس کی ذات اور مذہب کے ڈال سکتے ہیں۔ ان کا فرض ایک
بہت بڑا اور پاک فرض ہے انھوں نے اپنی زندگی انسان کی روح کی
حالت کو سدھارنے اور اشرف بنانے میں وقف کر دی ہے یہ وہ کام ہے
جو انسان کی پیدائش کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ جتنی بھی ایثار نفسی ایسے کام
کے لئے کی جاوے وہ بہت کم ہے وہ افراد جو ایسے پاک کام میں مشغول ہیں
وہ باہمی قومی جھگڑوں و معاشی تنازعات کو حقارت کی نظر سے دیکھ
سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے منجملہ
ان تعلیمی مسائل کے جنکی اہمیت دن بدن بڑھتی جائے گی ایک یہ
ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد بڑھانے کے لئے کس نوعیت کی تعلیم دینا
چاہیئے اور اس اتحاد کے قائم کرنے یا بگاڑنے میں ہماری قومی تاریخ کیا

اور ہمارے اساتذہ اور پروفیسر کے طریقہ عمل کو بہت کچھ دخل ہوگا یہی وجہ ہے کہ صحیح تاریخ پڑھائے جانے کے مسئلہ پر میں اس قدر مصر ہوں مدرسہ تعلیم المعلمین میں اتحادی نقطہ نظر سے ان طلباء کے خیالات پر جن کے سپرد آئندہ نسلوں کے خصایل درست کرنے کا پاک کام سپرد کیا جانے والا ہے خاص طور سے توجہ کی جائے۔ کسی استاد سے جذبات تعصب کا ظاہر ہونا اس کی ناقابلیت کی ایک وجہہ قرار دی جا سکتی ہے۔ ہر معلم سے ملازمت کے وقت ایک ایسے اقرار صالح و معاہدہ پر دستخط یا مہر حاصل کرنا چاہئے کہ جس میں یہ لکھا ہو کہ وہ اپنے شاگردوں میں فرق نہ کریگا۔ کیا میری یہ تجویز مضحکہ خیز معلوم ہو رہی ہے ؟ جو لوگ اس نوعیت کی شکایتوں سے واقف ہیں جو کہ بعض اوقات طلبہ کیا کرتے ہیں وہ اس کو مضحکہ خیز تجویز نہ سمجھیں گے۔ جو صورت پیدا ہوگئی ہے وہ غیر معمولی ہی اور غیر معمولی تدابیر اور علاج کی ضرورت بھی ہے۔ گورنمنٹ کے لئے اُن تمام تدابیر کا اختیار کرنا جائز ہوگا جن سے ہمارے اساتذہ کو پوری طرح سے ذہن نشین ہو جائے کہ اس مسئلہ پر گورنمنٹ کی پالیسی کیا ہے۔ میرے ذہن میں ایک بات اس وقت اور آرہی ہے۔ میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ ہر اسکول میں جب طلباء کسی درجہ کے پہلے گھنٹہ میں جمع ہوں تب اساتذہ درس شروع کرنے کے قبل اولاً ایک سوال حسب ذیل مضمون کا طلبا سے کیا کریں "تم کو کیوں تعلیم دی جا رہی ہے ؟" اس کے جواب میں سب طلبا ایک منہ سے یہ کہیں "اس غرض سے کہ بہتر انسان بن جائیں

خدا کی خدمت کریں۔ انسانوں کی خدمت کریں اپنے اہل وطن سے خواہ ان کا کچھ ہی ملت مذہب ہو محبت سے پیش آئیں اس کا ہم اقرار کرتے ہیں" اگر ایک لڑکا سات آٹھ برس کی عمر سے جب اس کی پڑھائی شروع ہوتی ہے بیس اکیس برس کی عمر تک جب پڑھائی ختم ہوتی ہے روزانہ اس اقرار و وعدہ کو اپنی زبان سے ادا کرتا رہے تو اس کا مجموعی اثر اس کی طبیعت و سیرت و عادت پر کیا پڑے گا اس کا اندازہ صرف ذہن میں کیا جا سکتا ہی جو لڑکا یا لڑکی کم از کم اس اصول کا حامی بھی نہ ہو وہ اس قابل نہیں کہ سرکاری خزانہ کی مدد سے اس کو تعلیم دی جائے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جبکہ میں ولایت سے ہندوستان واپس آرہا تھا جہاز پر مجھ سے اور ایک جاپانی سے جو کہ اعلیٰ افسر معلوم ہوتا تھا ایک بڑی دلچسپ گفتگو ہوی۔ جاپان اور امریکہ کے باہمی تعلقات کے متعلق اس جاپانی کی تقریر کا مضمون قریب قریب حسب ذیل تھا:۔

"یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں ہماری عزت و وقار کا قطعی تصفیہ امریکہ سے جنگ عظیم ہی کر سکتی ہے۔ امریکہ کا جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہے اس کے مد نظر اور کوئی دوسرا چارہ باقی نہیں رہتا۔ کل جاپان اس لڑائی کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ جب لڑکے مدرسہ میں جمع ہوتے ہیں تو اُستاد پہلا سوال لڑکوں سے یہ کرتا ہے کہ تم کو تعلیم کس غرض سے دیجاتی ہی اس کے جواب میں ہر لڑکا اپنی زبان سے کہتا ہے کہ تعلیم اس غرض سے دیجاتی ہے کہ ہم ایک روز امریکہ سے مقابلہ کریں اور لڑیں" یہ اُس جاپانی

کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ قوم بنانے کے یہ طریقے ہوا کرتے ہیں۔ موجودہ سن رسیدہ
اشخاص کی طبیعتوں کو جو ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں
تبدیل کرنا دشوار ہے۔ لیکن کچی شاخ جھکائی جاسکتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے
کہ ہمارا کنارہ صاف دکھلائی دے رہا ہے۔ اگر ہم کنارے پہونچکر غرقاب
ہوگئے تو وہ غرقاب کرنے والی چیز ہندو مسلمانوں کے باہمی تنازعات
کے پتھر ہی ہونگے جن سے ٹکرا کر ہماری کشتی تباہ ہوگی۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنے
لڑکوں اور لڑکیوں کی جو آئندہ نسلوں کے ماں باپوں کی تربیت اس خیال کی نیو
راسخ سے کریں کہ اتحاد رکھنا ہمارا فرض اولیں ہے اتحاد ہو ہمسایہ سے۔ اتحاد
ہو ہم وطنوں سے۔ اتحاد ہو بنی نوع انسان سے۔ تعلیم کا نصب العین اس سے
اعلیٰ تر نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے ابنائے وطن کے غور و فکر کے لئے تجویز متذکرہ بالا
پیش کر رہا ہوں یہ مسئلہ ہماری قومی حیات و ممات کا ہے اگر میری تجویز منظور
فرمائے گا تو آپ کا کوئی نقصان تو ہوتا نہیں البتہ فائدہ کی امید ہے۔
بہر کیف یہ ترکیب آزمانے کے قابل ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ روز بروز
خوفناک صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ سب ترکیبیں ناکامیاب ہوتی چلی
جارہی ہیں۔ ذرا طریقہ تعلیم کی ترکیب کو بھی آزمائیے۔ اگر ایک مرتبہ ہماری
تعلیم و تربیت اس نوع کی ہوگئی کہ ہم میں ضروری اتحاد پیدا ہوگیا تو
پھر ہمارے دماغ دوسرے بڑے بڑے کاموں کے لئے آزاد ہوجائنگے
ہندوستان کا شمار بھی اس دنیا میں علم و ہنر کے علمبرداروں میں ہوجائگا۔

---

(۸) دنیا کی مختلف یونیورسٹیز یا جامعہ میں اتحاد عملی

اس وقت تعلیمی دنیا میں ایک بڑی تحریک موجزن ہے۔ علم وہنر کے مرکزوں میں حصول علم کی عام غرض کے واسطے باہمی اتحاد وارتباط کی ایک خاص رغبت معلوم ہو رہی ہے۔ امریکہ کے ماہرین فن تعلیم اس تجویز کے ممکنات پر غور فرما رہے ہیں کہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسر ایک دوسرے سے کچھ دنوں کے واسطے اپنی اپنی جگہ بدل لیا کریں تاکہ جو خاص بات ان کو معلوم ہو وہ دوسروں کو سکھائیں اور جو ان کو نہیں معلوم ہے وہ دوسروں سے سیکھیں۔ عرصہ قریب دو برس کا ہوا کہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر تشریف لائے تھے جنھوں نے ہندوستان کے مختلف تعلیمی مقامات یا تعلیمی مرکزوں کا دورہ کر کے تجویز مذکور کے اصل مطلب وغرض کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ صاحب حیدرآباد بھی تشریف لائے تھے۔ انگلستان اس کی کوشش کر رہا ہے کہ کل سلطنت برطانیہ کی یونیورسٹیز کا مرکز بن کر ان تمام سے اپنا تعلق باہمی اتحاد وارتباط کے اصولوں پر مبنی کرے۔ ہماری ریاست بھی اس صدر مرکز کی مدد وتائید کر رہی ہے۔ سرکار عظمت مدار کی سرپرستی میں ماہرین فن کا ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے جس میں ہندوستان کی تمام مستند ومسلمہ یونیورسٹیز اپنے نائبوں کو بھیجکر اس کے مشترکہ مشوروں میں حصہ لیتی ہیں انکی غرض یہ ہوا کرتی ہو کہ اُن تمام اصولی مسائل پر جس کا تعلق عام مسئلہ تعلیم سے ہو ایک باہمی سمجھوتہ ہو جائے اس کی یہ غرض نہیں ہوتی ہے کہ کسی یونیورسٹی کی آزادی میں

رکاوٹیں پیدا ہوں یا دخل دیا جائے۔ اس بڑی اور عالمگیر تحریک کا مستقبل
عظیم الشان معلوم ہو رہا ہے میں نے جس نگاہ سے اس تحریک پر نظر ڈالی ہے
اسکو بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میری طبیعت کا رجحان اس
مسئلہ پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالنے کا ہے۔ باوجود ان تمام اختلافات کے جو
دنیا کے مختلف اقوام میں بوجہ اختلاف رنگ شکل۔ جسم۔ عادات۔ اطوار
اور تمدن کے دکھائی دے رہے ہیں پھر بھی تمام انسانوں میں دماغی قوتیں
اور خیالات اس قدر مشترک ہیں کہ اس اشتراک کی وجہ سے وہ ایک دوسرے
کے دلی مطالب کو سمجھ سکتے ہیں۔ تمام انسانوں کی منطق یکساں ہی ہے۔ حق کے
دریافت کرنے کے طریقے اور تفہیم کے طریقے یکساں ہیں۔ یہی مشترک اجزائے
فن تعلیم کی ایک سچی سائنس یا علم کی بنیاد بن کر بنی نوع انسان کو یکساں فائدہ
پہونچا سکتے ہیں یہی مشترک اجزاء سب اقوام کے لئے ایک مشترک جائے
نشست بن سکتے ہیں۔ اس عظیم الشان تحریک میں باوجود ہمارے باہمی
اختلافات کے اتحاد کی صورت نظر آرہی ہے اور باوجود جدائی کے یگانگت
ممکن ہے ایسی مشترک نشست پر بیٹھنے سے ممکن ہے کہ ہمارے مشترک اجزائے
اختلافی اجزاء پر غالب رہیں۔ لہذا ہم بہت خوشی کے ساتھ اُس ہاتھ سے مصافحہ
کرتے ہیں جو تعلیم کے میدان میں ہماری جانب بڑھایا گیا ہے۔ علیحدگی کا زمانہ
گیا۔ ایک وقت تھا جبکہ مشرق کو اپنے تنہا معلم و اُستاد ہونے کا دعویٰ تھا
مغرب سے کسی بات کو سیکھنا اپنی توہین کا باعث سمجھتا تھا۔ مشرق کا خیال
یہ تھا کہ اس کے تمام علوم مکمل ہو چکے۔ اور ہر شعبہ علم پر جو کچھ کہا جا سکتا تھا

متقدمین کہہ گئے۔ یہ طلسم اب ٹوٹ گیا۔ ہمارے خیالات اور ہمارے دعوے صحیح نہیں پائے گئے آج ہم اس کے معترف ہیں کہ ہم کو اپنی عظمت کے نسبت غلط خیالی سے بہت کچھ بھگتنا پڑا۔ ایک لحاظ سے اب مشرق مغرب کا غلام بن گیا۔ آج ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر مشرق کا یہ دعوی ہے کہ وہ مغرب کو تعلیم دے سکتا ہے تو مغرب بھی مشرق کو بہت سی باتیں سکھا سکتا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں ایک دوسرے کے استاد و شاگرد بن سکتے ہیں۔ اگر مشرق نے مغرب کو اپنے مذاہب و روحانی ترقی سے چکاچوندہ کر دیا تو مغرب نے بھی اپنے مادی ترقی سے مشرق کو متحیر کر دیا۔ اگر روحانیات میں مغرب حضرت عیسٰی کے سامنے جو سرزمین مشرق کی ایک پاک ہستی ہیں سجدہ کر رہا ہے تو مادی معاملات میں مشرق کو بھی مغرب کی بہت سی ہستیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا پڑتا ہے۔ مشرق کسی خاص ترجیح و فضیلت کا صرف اس وجہ سے مستحق نہیں ہو سکتا کہ مغرب ابھی تک مادے کی اصلیت و حقیقت کے دریافت کرنے میں مشغول رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہر حق حق ہوا کرتا ہے اور ہر حق کی قدر و قیمت ایک ہی ہوا کرتی ہے۔ وہ لوگ جو کہ مادہ کی حقیقت دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کا کام اسی قدر اہم ہے جیسا کہ ان لوگوں کا جو روحانیت کے حقائق دریافت کرنے میں مصروف ہیں یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ کوئی شئے کب تک مادہ رہتی ہے اور کب جان میں مبدل ہو جاتی ہے۔ وہ چیز جو کہ آج ذرہ خاک کی صورت میں ہمارے پاؤں کے نیچے ہے کل ہم اس کو زندگی کی قوت سے متحرک دیکھتے ہیں۔ وہ

لوگ جو مادہ کی نوعیت دریافت کرنے میں مشغول ہیں حقائق کی اسی مسلسل
زنجیر کی ایک کڑی کی ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس
تمام عالم کو احاطہ کئے ہوئے ہے حق کا دائرہ کسی مقام میں محدود نہیں
ہے مشرق ہو یا مغرب۔ حق کسی شئے سے مقید نہیں ہے۔ مادہ ہو یا روح
تمام عالم من حیث المجموع ایک متحدہ شے ہے اس کے سمجھنے کے لئے مادہ
و روح دونوں کی نوعیت معلوم کرنا ضروری ہے۔ عالم روحانیات کے نقطۂ نظر سے
اگر حق میں زندگی کی قوت شامل کر دی جاوے تو وہی اصل تصور خدا کا ہے
انسان ہر حق کے علم ہونے سے خواہ اس کا تعلق عالم اجسام سے ہو یا عالم
ارواح سے خدا سے قریب تر ہو جایا کرتا ہے اور خدا کا معلوم کر لینا یا اس
عالم اسباب کی آخری کڑی کو پہچان لینا انسان کی تعلیم کا آخری زینہ
یا معراج ہے۔ کم از کم اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے تمام بنی نوع
انسان متحد و متفق ہو سکتے ہیں جب حق کے معلوم کرنے کے لئے تمام انسان
متحد و متفق ہو کر کوشش کرینگے تو ظاہر ہے کہ حقائق کے معلوم کرنے کی رفتار
میں بھی ترقی ہو جائے گی باوجود جہالت کی تاریکی کے جس میں ہم اس وقت
گھرے ہوئے ہیں۔ باوجود جنگ و جدل کے شور و غوغا کے۔ باوجود قومی
اغراض و ذاتیات کے تصادم کے۔ باوجود انتہائی مقامی و ملکی مغائرت
کے۔ باوجود مذہبی تعصبات کے۔ اور ان تمام اختلافات کے۔ جو رنگ اور
فرقہ بندی سے اس دنیا میں پیدا ہو گئے ہیں اور جنھوں نے انسانوں کو
ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے کم از کم تمام مذاہب و فرقے اور اقوام و رنگ کے

ماہران فن ایک ہی مقام پر ایک ہی غرض مشترک حاصل کرنے کے لئے جمع ہوسکتے ہیں۔ مشترک جذبات سے متحرک ہوکر یہ ماہران فن دوش بدوش بڑھتے چلیں گے اور جہالت اپنے دشمن کا مقابلہ کرتے ہوے لڑتے ہوے فتح حاصل کرتے ہوے بالآخر اس چوٹی پر جا پہونچیں گے جہاں سچائی اور علم کا آفتاب کامل شان وشوکت کے ساتھ طلوع ہوتا ہوا جہالت کی تاریکی کو دور کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اُس کی روشنی ایسی تیز ہوگی جس سے وہ حقیقی تعلقات دکھائی دینے لگیں گے جو ایک انسان کی روح کو دوسرے انسان کی روح سے ہیں جو انسانوں کی روح کو اس دنیا کی دوسری جانوں کے ساتھ ہیں جو انسانوں کی روح کو مادہ کے ساتھ جو انسانوں کی روح کو تمام عالم کے ساتھ ہیں یا یوں کہئے کہ جو تعلقات کہ انسان کو خود خدا کے ساتھ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان تمام ماہران فن تعلیم اور ماہران دیگر علوم کی مشترکہ کوشش سے اس امر کے بیّن ثبوت مہیا ہو جائیں کہ تمام روحیں ایک ہی جسم کے اجزا ہیں یا ایک ہی آفتاب کے کرنیں ہیں۔ بنی نوع انسان کی آئندہ امیدیں صرف اسی علم واعتقاد سے وابستہ ہیں۔ انسان کو جب یہ حق معلوم ہو جاے اور اس کو پورا اعتقاد ہو جاے تو وہ عجیب وغریب کارنمایاں کرسکتا ہے۔ اس وقت نہ صرف یہ ممکن ہوگا کہ مشرق میں ہندو مسلمان سے اور مسلمان ہندو سے بغلگیر ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مشرق مغرب سے اور مغرب مشرق سے بغلگیر ہو اس وقت ریڈیارڈ کپلنگ کا یہ مقولہ کہ مشرق مشرق ہی ہے اور مغرب مغرب ہی ہے، تاریخ کا ایک گزشتہ واقعہ ہو جائے گا اور اس

قسم کے معلومات جس سے یہ عجیب و غریب نتائج پیدا ہوں سوائے اس پاک مقام کے کہاں حاصل ہوسکتے ہیں جہاں تمام دنیا کے ماہرین تعلیم اور غور و فکر کرنے والے حکما حق اور اسکے طریقہ دریافت معلوم کرنے کی غرض سے جمع ہوں۔ نوعیت تعلیم ہی کا فرق تھا جس نے مشرق کو مغرب سے جدا کر رکھا ہی کیا یہ ممکن ہی کہ وہی تعلیم جب ٹھیک طریقہ سے دی جائے تو مشرق کو مغرب سے بغلگیر کرادے۔ اگر مشرق ضرورت سے زیادہ خیالی اور روحانی واقع ہوا ہے اور مغرب ضرورت سے زیادہ پُر عمل اور مادی واقع ہوا ہے تو یہ ممکن ہے کہ صحیح تعلیم کی مدد سے ایک درمیانی راستہ مل جائے جس پر دونوں اقسام کے انسان ساتھ ساتھ چل کر بالآخر مشترکہ نشست گاہ پر قیام کریں میں ضرورت سے زیادہ فلسفیانہ خیالات میں پڑ گیا آپ حضرات مجھے معاف فرمائنگے اصلیت یہ ہی کہ اس عظیم الشان تحریک کو دیکھ کر جو کہ دنیا کے ماہرین فن تعلیم کو اتحاد اور مشترکہ کوشش کی طرف مائل کر رہی ہے اور جس کے آثار اُفق پر نمایاں ہیں میرے دل میں اسی نوعیت کے خیالات اُمنڈ اُمنڈ کر آتے ہیں جن کا ذکر میں ابھی کرچکا ہوں۔

(۹) تعلیمی اصلاح کی فوراً کوشش کرنے کا مسئلہ

جب میں نے اپنے خطبہ کو شروع کیا تھا تو تین ایسے خیالات پیش کئے تھے جن کے لحاظ سے میری رائے میں ہندوستان کی آئندہ تعلیمی پالیسی کا فیصلہ

ہونا چاہیے انھیں تین خیالات کے متعلق عملی تدابیر بتانے کے سلسلہ میں میں نے آٹھ تعلیمی مسائل پر نظر ڈالی ہے یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میری تدابیر میں کوئی نئی بات نہ ہوگی میں نے صرف اُن ہی باتوں کو دُہرایا ہے جس پر اخبارات اور پبلک و عوام اس قدر زور دے رہے ہیں میں ہندوستان کی ہر گورنمنٹ سے ملتجی ہوں کہ اصلاح تعلیم کا مسئلہ تمام اصلاحات پر مقدم رکھا جائے جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہی ہمارے روشن خیال بادشاہ نے اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے چند مدبرین کی کمیٹی مقرر فرمادی ہی۔ برٹش انڈیا میں تعلیم کا انتظام پبلک کے نمایندوں کے سپرد کردیا گیا ہی لہذا اگر خیالات متذکرہ بالا میں کچھ وقعت ہی تو میں امید کرتا ہوں کہ وزرائے صوبہ جات صرف اس خیال سے پس و پیش نہ کرینگے کہ جو تبدیلیاں کرنی پڑینگی اُن سے تعلیم کا سارا ڈھانچہ بدلنا پڑتا ہے پس و پیش کرنے کی کافی وجہ نہیں ہے اگر وہ اصلاح کرنے پر آمادہ ہوں تو سارا ملک ان کا ساتھ دے گا لوگ اب اس کو سمجھنے لگے ہیں کہ صرف کتابی یا ادبی تعلیم بے سود ہے اگر وہ اصلاح کے لئے آمادہ ہوں تو دنیا کے ماہرین فن تعلیم ان کا ساتھ دینگے ہماری تعلیم کا ڈھانچہ وہی ہی جس کو لارڈ میکالے اور لارڈ بنٹنک نے ایک صدی پیشتر بنایا تھا لیکن باقی دنیا اپنے طریقہ تعلیم میں سرعت کے ساتھ ضروریات کے مدنظر تبدیلی کرتی چلی جارہی ہے۔ ہمارا پورا مستقبل طریقہ تعلیم سے وابستہ ہے اگر تبدیلیوں کی وجہ سے چند مدارس کو بند کرنا پڑے تو کیا مضائقہ ہے بند کر دیجئے۔ اگر اسکی وجہ سے ہمارے پورے نصاب کو بدلنا پڑے تو کیا مضائقہ ہی بدل دیجئے

آئندہ مستقل فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے زمانہ حال کی مشکلات اور دشواریوں کا
مقابلہ کر لیجئے جو صورت اس وقت پیدا ہوگئی ہے وہ غیر معمولی ہے اور غیر معمولی صورت
کیلئے غیر معمولی تدابیر کا اختیار کرنا ضروری ہے میں ان حکام کی مشکلات کو جن کو
عملی کام کرنا ہوتا ہے اچھی طرح سے محسوس کرتا ہوں لیکن کچھ تو فوری کرنا چاہیئے
جس طرح سے کہ آنکھ کا ذرا سا زاویہ نظر بدل دینے سے ایک دوسرا منظر دکھلائی
دینے لگتا ہے اسی طرح ان برادران وطن کی تعلیمی پالیسی خیالات وطبیعت میں
جنکے ہاتھ میں عنان تعلیم ہے تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو جانے سے ملک کی عام ترقی
میں ایسے تغیرات پیدا ہو سکتے ہیں جنکے اثرات بہت دور تک پھیلیں گے۔ مین نا اُمید
نہیں ہوں امید رکھنا میرا ہمیشہ کا مسلک رہا ہے میں آپٹی مسٹ ورجائی ہوں
یہ صحیح ہے کہ مسئلہ تعلیم ہمارے بہترین اشخاص کی خدمات اور توجہات کا مستحق ہو گیا
ہے اسکو ایسے افراد کی ضرورت ہے جنکے دماغ مشرق کی تہذیب اور تمدن سے آراستہ
ہوں اور مغرب کی روز افزوں ترقی کرنے والے خیالات اور علمی معلومات سے منور
ہوں اس کیلئے ایسے پختہ اور معتدل طبیعتوں کی ضرورت ہے جو کہ بہترین ایثار صرف
رفاہ انسانی کے خیال سے بغیر کسی صلہ معاوضہ کی امید کی کریں کیونکہ اسمیں نہ وہ
چمک دمک ہے اور نہ دوسروں پر حکومت کرنے کی وہ امیدیں نظر آتی ہیں جیسا کہ
آج کل سیاسی زندگی میں ممکن ہے ہم کو ایسے ارباب علم وادب کی ضرورت ہے جو کہ
باوجود دنیاوی رفعت اور منزلت کی ترغیبوں کے جو کہ ان کے راستہ میں آجاتی ہیں یا
پھر بھی تعلیم کے اس بے دکھاوے والی عبادت گاہ میں داخل ہونا پسند کرتے ہیں جہاں
کوئی بڑی خوش کن باتیں نہیں ہیں جہاں زندگی کو خوشگوار اور پسندیدہ بنانے

کیلئے سوائے انسانی ہمدردی اور محبت کے چشمہ کے کچھ نہیں ہی مادر ہند کے ایسے بہت سے لائق سپوت موجود ہیں اس کانفرنس کا انتظام ایسے ہی اشخاص نے کیا ہی ہمارا مستقبل بہت بلند و اعلیٰ ہی فوری اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے پھر کامیابی ہمارے حصہ میں ہوگی

حیدرآباد دکن میں تعلیمی ترقی اور حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ کیلئے دعا

ابھی تک تو میں موجودہ ترقی تعلیم کی نکتہ چینی اور نقائص تبلانے کے ناگوار فرض کو ادا کرتا رہا لیکن اب مجھے اس خوشگوار فرض کے بجالانے کا موقع ملا کہ حیدرآباد دکن میں تعلیم کے متعلق اب تک کس قدر کوشش بلیغ کی جا چکی ہی اور کیا نتائج پیدا ہوچکے ہیں گزشتہ چند سالوں میں اس ریاست کی تعلیمی حالت میں عظیم الشان ترقی و تغیرات ہو چکے ہیں ایک کروڑ سے زیادہ بنی نوع انسان کے فائدہ کیلئے ابتدائی تعلیم مفت کردی گئی ہے تعلیمی مصارف ۱۸ لاکھ سے ۶۸ لاکھ ہوگئے ہیں تعلیمی ادارات و مدارس کی تعداد جو علم و حکمت کی اشاعت میں مصروف ہیں ۵۳۶۶ سے بڑھ کر ۸۰۹۳ ہوگئی ہے اور جو طلباء ان سے مستفید ہورہے ہیں انکی تعداد ۱۴۶۳۶۰ سے بڑھ کر ۳۱۹۰۵۲ ہوگئی ہے عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے جو مشرق اور مغرب کو ملا دینے کی کوشش کر رہی ہی اور جس کا مستقبل شاید کبھی یہ ہو کہ مشرق کا دوسرا قرطبہ ہو جائے اگر حیدرآباد شہر کے ایک گوشہ میں آپ کو طبی کلیہ دکھائی دیتا ہے جہاں مغربی علم طب کی جدید ترین مستند کتابوں کی تعلیم مادری زبان میں یورپ کے بہترین تعلیم یافتہ پروفیسر اپنے طلباء کو دیتے ہیں اور جہاں ایک ایسے شفاخانہ سے مدد لی جاتی ہے جو ۲۲ لاکھ

روپیہ خرچ کرکے بنایا گیا ہے اور جس کا مقابلہ ایشیا کے بہترین شفاخانوں سے
کیا جاسکتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اسی شہر کے دوسرے گوشہ میں آپ کو مسلمہ
شہرت کے اطبا بھی نظر آئیں گے جو ایک نوجوان گروہ کو یونانی طب کی
تعلیم دیکر تیار کرنے میں مصروف ہیں یہ نوجوان یونانی اطبا ریاست کے
دور دراز مقامات میں جاکر اپنی دیسی ادویات سے جو امیر اور غریب دونوں کو
آسانی سے حاصل ہو سکتی ہیں بنی نوع آدم کے دکھ درد کو دور کرنے میں مدد
کرتے ہیں اگر شہر کے دوسرے حصہ میں تشریف لیجائیے تو آپ کو معلوم
ہوگا کہ ایک انجنیرنگ کالج بھی ہے جہاں سے نئے حیدرآباد کے میر تعمیر و
نقشہ ساز و معمار نکل رہے ہیں۔ دار الضرب کو ملاحظہ کیجئے تو وہاں آپ کو
صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ ملے گا جہاں ریاست کے ہونہار میکنیکس
اور کلوں کے بنانے والے تعلیم پارہے ہیں اگر آپ قانونی تعلیم کی طرف رخ
کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کی اعلیٰ ال ال بی ڈگری کی تعلیم
کے علاوہ سیکڑوں لڑکوں کو قانون کے ابتدائی اصولوں کی تعلیم عدالت العالیہ
کے زیر نگرانی ایک دوسرے قانونی مدرسہ میں دی جاتی ہے جو دور دراز
مقامات کی ان چھوٹی چھوٹی عدالتوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں جہاں
جامعہ کے اسناد یافتہ اشخاص جانا پسند نہیں کرتے۔ حیدرآباد میں آپ کو
ایک آرٹس اسکول یعنی مدرسہ فنون لطیفہ بھی دکھلائی دے گا جو علم جمالیات
کی جانب متوجہ ہے۔ حیدرآباد کی سرویس و طبقہ عہدہ داران کی عام
لیاقت و قابلیت کا پایہ بلند کرنے کی غرض سے حیدرآباد سول سروس کلاس

دوبارہ کھولا جارہا ہی جہاں اہل ملک کے معزز خاندانوں کے لڑکوں کو جنھوں نے کالج کی ڈگریاں حاصل کی ہیں مقابلہ کے ایک امتحان میں شرکت کا موقع دیا جائےگا ان میں سے چوٹی کے کامیاب شدہ طلبا بقدر ضرورت منتخب کرکے ان کو ابتداءً ایک سال حیدرآباد میں خاص قسم کی تعلیم دینے کے بعد ایک سال برٹش انڈیا کے بڑے بڑے سرکاری دفاتر میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا جاویگا معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں ایک فوجی کالج کی اسکیم بھی اعلیحضرت بندگانعالی نے منظور فرمائی ہے ہمارے یہاں رقم کثیر صرف کرکے ایک مدرسہ جاگیرداران بھی بنایا گیا ہے جہاں یورپ کے تعلیم یافتہ اساتذہ مقرر کئے گئے ہیں جامعہ عثمانیہ کے ملحقہ کلیات کے علاوہ ایک اور کلیہ بھی ہے جس کا تعلق جامعہ مدراس سے ہے دو مدارس نسواں بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں جنکے صدر یورپین خواتین ہیں اور جو کالج کے درجہ پر پہونچنے کے لئے نظر بلند کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ خواہ آپ اس معنوی یا بالواسطہ تعلیم دینے کے ذرائع پر غور فرمائیں جو رود موسیٰ کے کناروں کے وسیع اور خوشنما باغات چمنوں اور باغ عامہ کی عالیشان نمائش گاہ ایسے مقامات سے ممکن ہے یا آپ ان عطیات اور امداد کی صریحی یا بلاواسطہ تعلیمی قدر وقیمت پر خیال فرمائیں جو سرکاری خزانہ سے کاغذ سازی پارچہ بافی وغیرہ جیسی مقامی صنعتوں کو اور اضلاع کے مدارس صنعت وحرفت کو دیجاتی ہے تو دونوں صورتوں میں اس نتیجہ پر پہونچے بغیر آپ نہیں رہ سکینگے کہ تمام ریاست میں عظیم الشان تعلیمی ترقی اور تحریک کے آثار نمایاں ہیں شہر کے قدیم کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ گزشتہ سال ہی ایک نئی خوشنما

عمارت جدید کتب خانہ کے لئے باغ عامہ کے خوشگوار منظر میں بنا کر کھڑی کی گئی ہے ایک طریقہ ایشیاٹک اسکالرشپ یعنے تعلیمی وظیفہ اندرون ایشیا کا قائم ہے جسکی امداد سے حیدرآبادی طلباء کا نام برٹش انڈیا کے بڑے مستند کالجوں کے رجسٹروں میں آپ دیکھیں گے اور دوسرا طریقہ فارن اسکالرشپ یا وظیفہ بیرون ایشیا کا جاری ہے جسکی امداد سے کیمبرج آکسفورڈ۔ اڈنبرا۔ مانچسٹر، لنڈن، برلن اور امریکہ جیسے بڑے بڑے تعلیمی مرکزوں میں علم و حکمت کے چشموں پر اس سرزمین کے بچوں کو سیراب ہوتے ہوے آپ پائنگے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان میں کوئی ایسی بھی ریاست ہے جس میں اتنے یورپ کے تعلیم یافتہ اشخاص سرکاری ملازم ہیں جتنے کہ ریاست حیدرآباد میں ہیں۔ بر سبیل تذکرہ گزشتہ سال کیمبرج میں مجھے یہ معلوم ہونے سے خوشی ہوی کہ وہاں کے کسی کالج میں شرکت کی سفارش کیلئے صرف حیدرآبادی ہی ہونا کافی سمجھا جاتا ہے جہاں تک میرا علم ہے ہمارے بادشاہ نے اپنے پیغمبر صلعم کے ہم وطنوں کی تعلیم کیلئے عرب کے ریگستان پر بھی مدرسہ قائم کر رکھا ہے ذرا برٹش انڈیا کی اُن تعلیمی ادارات کی فہرست پر نظر ڈالئے جن کو ہماری سرکار سے ہزاروں کی امداد ملتی ہی صرف ایک مسلم یونیورسٹی کو تین ہزار روپیہ ماہانہ امداد میں دیا جاتا ہی یہ کانفرنس بھی جو سیکڑوں غریب لڑکوں کو وظیفہ دیکر تعلیم دلاتی ہی ہمارے بادشاہ کی مسیحا نفسی اور ہمدردی پر قائم ہے۔ طبیعت کی اُس بلندی پر نظر ڈالئے ناظم صاحب تعلیمات کو بصرف کثیر جاپان بھیجنے اور وہاں کے تعلیمی مسائل ہے

واقف کرانے میں پنہاں ہے۔ دل کی اُس عالی ہمتی کا تصور کیجئے جو ناظم
آثار قدیمہ کو انگلینڈ۔ فرانس۔ اسپین مصر اور فلسطین ایسے مقامات پر ا
غرض سے بھیجے جانے میں مضمر ہے کہ وہاں سے معلومات حاصل کرکے وہ مش
آثار صنادید کے خزانے جو سرزمین دکھن کی قدیم عمارتوں میں دفن ہیں
نکالیں اور اس سے سچی تاریخ پر روشنی ڈالیں۔ دماغ کی اس دور اندیش
بلند پروازی پر غور کیجئے جو ہندوستان کے بہترین علمائے لسانیات کو جا
کے دار الترجمہ میں جمع کرنے میں شامل ہے جہاں وہ زبان مالامال کیجار
جس کو چند اشخاص نے ذریعہ تعلیم ہونے کے ناقابل ٹھہرایا تھا اس ہن
علم دوست و علم پرست پادشاہ سریر سلطنت حیدرآباد پر متمکن ہیں
جن کے عہد میں وہ شاندار نتائج پیدا ہوئے ہوں جن کا ذکر میں کرچکا
ایسے پادشاہ اور ایسے سرپرست علم و حکمت کے لئے میں استدعا کر
کہ آپ حضرات دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں۔

”زندہ و خوش باد ہزاگزالٹڈ ہائینس آصف جاہ نظام الم
سلطان العلوم نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر جی سی یس
جی سی۔ بی۔ ای پادشاہ حیدرآباد دکن“

بسعر زایار جنگ بالمیع للہ